طنز و مزاح

غیر مُلکی سیّاح کا سفر نامہ لاہور
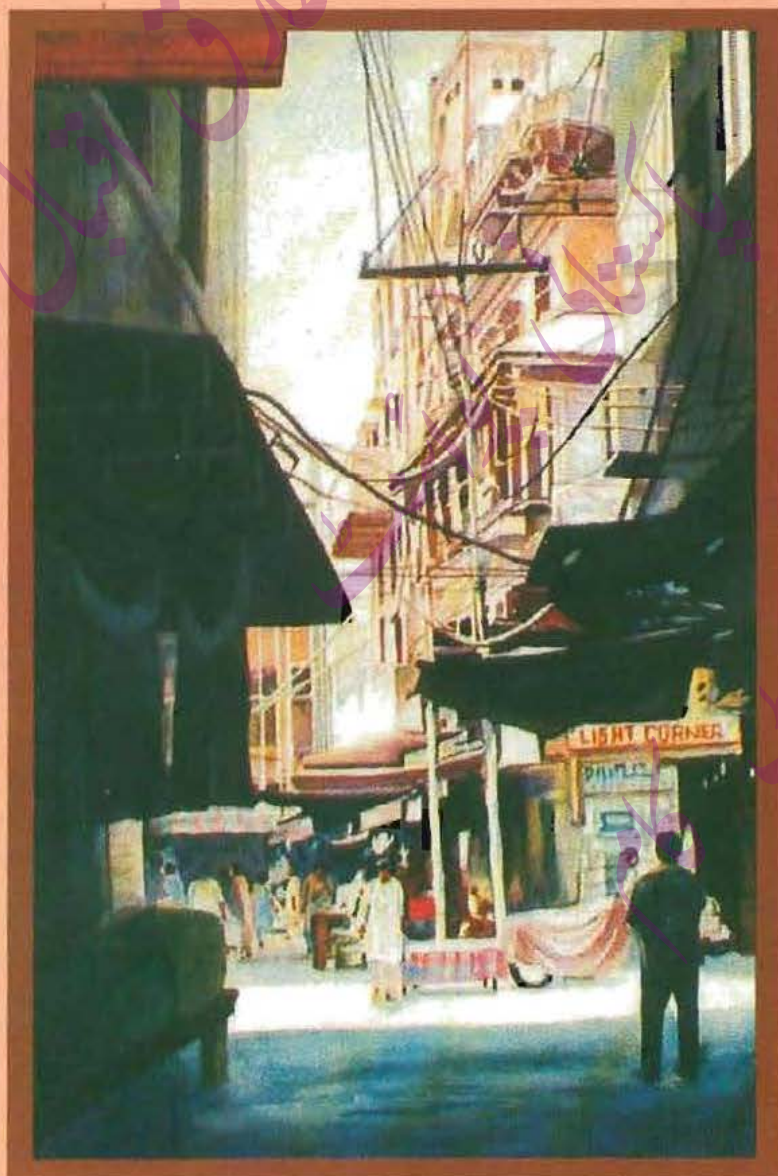
عطاء الحق قاسمی

غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور

عطاء الحق قاسمی

نستعلیق مطبوعات
F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-4489310
E-mail: nastalique@yahoo.com

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ○

القرآن

اہتمام : حسن محمود

سرورق: آغا نثار

کمپوزنگ: ایمان گرافکس' لاہور 0322-8492144

اشاعت: جولائی 2007

مطبع: حاجی حنیف پرنٹرز لاہور

قیمت: 150 روپے

بیرون ملک: 10 امریکی ڈالر

نوٹ: اس سفرنامے کا ایک حصہ مصنف کی کتاب ''خندۂ مکرر'' میں شامل ہے۔

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور

0300-4489310

E-mail: nastalique@yahoo.com

پروفیسر فتح محمد ملک

کے نام

ترتیب

''ڈاکٹر'' عطاء الحق قاسمی

مزاح نگار، شاعر، ڈراما نگار، کالم نویس، سفرنامہ نگار، مدیر، سفارت کار معلم اور خوب صورت دل کے مالک..... عطاء الحق قاسمی کی شخصیت کی ''پرزم'' سے یہ صفات شعاعوں کی مانند منعکس ہوتی ہیں۔ یہ ایسی صفات ہیں کہ ان میں سے کسی کو ایک آدھ بھی مل جائے تو بڑی بات ہے جبکہ عطاء الحق قاسمی یہ سب کچھ ہے اور اس کے باوجود اس کے پاؤں زمین پر ہیں، دماغ چوتھے آسمان تک نہ پہنچا..... یاروں کا یار!

عطاء الحق قاسمی پر قلم اٹھایا تو اس کی بے ریا دوستی کے متعدد واقعات ذہن میں آ رہے ہیں۔ کیا لکھوں کیا نہ لکھوں؟ لہٰذا ذاتی حوالہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف ''غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور'' تک ہی خود کو محدود رکھتا ہوں اس کتاب کے قاری کو یہ یاد رہنا چاہیے کہ خود عطاء الحق قاسمی بھی جہاں گشت ہے۔ میں جس آسانی سے علامہ اقبال ٹاؤن کی مون مارکیٹ فوٹو سٹیٹ کرانے کیلئے جاتا رہتا ہوں اسی آسانی سے عطاء الحق قاسمی دوسرے ممالک کو جاتا رہتا ہے۔ کسی نے اس کے بارے میں خوب لکھا تھا کہ جب عطاء الحق قاسمی کبھی کبھار پاکستان کے مختصر دورہ پر تشریف لاتے ہیں تو ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ عطاء الحق قاسمی ابوبطوطہ کہلوانے کا حقدار ہے، اس مناسبت سے اس کے سفرنامے ابن بطوطہ قرار دیئے جا سکتے ہیں لیکن ''غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور'' کچھ دکھری ٹائپ کا سفرنامہ ہے۔ لاہور سے یہ نہ سمجھیے کہ یہ سفرنامہ محض لاہور تک محدود ہے اور باقی شہر اس سے خارج سمجھے جائیں۔ ایسا نہیں، لاہور

پاکستان کا دل ہے اس لیے لاہور تمام پاکستان کیلئے بلیغ علامت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لاہور کا یہ سفرنامہ دراصل پاکستان کے عوام اوران کے کردار وعمل کا آئینہ قرار پاتا ہے۔ اور یہاں کے افراد کا کیری کچر ہے لیکن سفرنامہ کو Distorting Mirror نہ سمجھا جائے۔ انداز نظر اور اسلوب کے لحاظ سے یہ سفرنامہ اردو کے طنزیہ ادب میں قابل قدر اضافہ ہی نہیں بلکہ طنز کی کاٹ اور مزاح کی چاشنی کی بنا پر ''غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور'' کا مطالعہ قاری کیلئے بیحد خوشگوار تخلیقی تجربہ ثابت ہوتا ہے۔

بقول عطاء الحق قاسمی:

''ان دنوں جو ادیب بیرون ملک جاتا ہے وہ واپسی پر سفرنامہ لکھتا ہے۔ اس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ جو غیر ملکی پاکستان آتے ہوں گے واپسی پر وہ بھی یقیناً ایک عدد سفرنامہ ضرور قلم بند کرتے ہوں گے۔ جس طرح ہمارے ہاں کے بعض سیاح کسی غیر ملک میں گزارے ہوئے چند گھنٹوں ہی سے اس کی پوری تہذیب اور تمدن کا کچا چٹھا کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں اسی طرح ممکن ہے بعض غیر ملکی سیاح بھی سپر ایکسپریس پر پاکستان کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اپنے قارئین کو پاکستانی عوام اور یہاں کی معاشرت کے بارے میں ''فیصلہ کن'' معلومات فراہم کرتے ہوں......، سو ہم نے چشم تصور میں ایک ایسے غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ ملاحظہ کیا ہے جس نے چند روز لاہور میں قیام کیا......''

عطاء الحق قاسمی نے پاکستان (جس سے اسے بے حد پیار ہے) اور پاکستانیوں کو ایک پاکستانی کی نہیں بلکہ غیر ملکی کی غیر جانبدار آنکھ سے دیکھا اور یہی مشکل کام ہے اس لیے کہ ہم جس معاشرہ میں زیست کرتے ہیں اس سے Conditioning کی وجہ سے

ہم اس کے داخلی تضادات اور افراد کی کرداری بوالعجبیوں کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں، بلکہ ہم تو خود بھی ایک کردار ہوتے ہیں لہٰذا سطح سے نیچے تہہ میں اتر کر، معاشرہ کی درست تفہیم آسان نہیں ہوتی۔ یہ صرف طنز نگار ہی بطریق احسن اس نوع کا خارجی مشاہدہ کر سکتا ہے اور وہ طنز نگار اگر عطاء الحق قاسمی ہو تو سونے پر سہاگہ والی بات درست ثابت ہوتی ہے۔

میں مزاح اور طنز کی تعریفات میں الجھے بغیر یہ عرض کروں کہ اگرچہ افہام وتفہیم کی سہولت کیلئے دونوں کا جداگانہ تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن دراصل یہ زندگی کے سکہ کے دو رخ ہیں اور ایسے لازم وملزوم جیسے حسن اور عشق دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں رہی بھرے پیٹ مزاح اور خالی پیٹ طنز والی بات تو یہ کج نظری ہے۔ یوں مزاح کا انفرادی تشخص مجروح ہوتا ہے اور طنز کے سماجی کردار کی نفی ہوتی ہے۔ دراصل طنز سماج کے خلاف مؤثر ترین ہتھیار اور ادیب کی سماجی کمٹمنٹ کا اظہار ہے۔ طنزیہ اسلوب میں چند برجستہ فقروں سے جس کامیابی سے منافقت کے پردے چاک کیے جاتے ہیں، مکروہ چہروں سے زریں نقاب نوچے جاتے ہیں، دوعملی کا بھانڈا پھوڑا جاتا ہے اور جھوٹی شہرت سے اونچی اڑتی پتنگوں کی ''بوکاٹا'' ہوتی ہے اس کے باعث طنز کارگر ہتھیار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے طنز کو نشتر سے تشبیہ دی جاتی ہے تو طنز نگار کو سرجن یا جراح قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہی فریضہ عطاء الحق قاسمی کامیابی سے سرانجام دے رہا ہے۔ اگر پاکستانی معاشرہ ہسپتال کا وارڈ ہے تو پھر ''ڈاکٹر'' عطاء الحق قاسمی ماہر سرجن ہے اور یہ کام وہ گذشتہ چالیس برس سے اپنے کالموں کے ذریعہ سے کر رہا ہے۔

کالم کی ایک ہی قسم ہوتی ہے اور وہ ہے کالم۔ البتہ بھانت بھانت کے کالم نگار

پائے جاتے ہیں۔ ایک انتہا پر گنتی کے وہ چند قابلِ احترام کالم نگار جنھوں نے قلم کی حرمت برقرار رکھی اور دوسری انتہا پر وہ جن کا کالم حسب ضرورت ریڈ کارپٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیشتر کالم نگار حکومت، معاشرہ، اقدار اور قدغنوں کے باغی ہوتے ہیں مگر یہی کالم نگار حکمرانوں کے گوڑھے دوست بھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے نیت کا کھوٹ کالم سے اثر چھین لیتا ہے:

خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

عطاء الحق قاسمی ان چند استثنائی شخصیات میں سے ہے جنھوں نے عفت قلم کی قسم اٹھائی اور اسے نبھایا بھی اور وہ بھی سرکار کا ملازم ہوتے ہوئے۔

بطور کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے اپنی باریک بینی کے بعد سب سے زیادہ کام کاٹ دار اسلوب سے لیا ہے۔ بلاشبہ وہ صاحب اسلوب قلم کار ہے۔ ایسا کارگر اسلوب کہ گہری سے گہری بات چند جملوں میں کہہ جاتا ہے اور ایسا موثر اسلوب کہ ہدف بھی مسکرا دے۔

''غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور'' کے چند ''ٹوٹے'' جب کالموں کی صورت میں چھپے (اس معاملے میں عطا رتن ناتھ سرشار کا پیروکار ہے جس کا معرکتہ الآراء ناول بھی اخبار میں قسط وار شائع ہوتا رہا تھا)۔ تو ان کا بطور خاص نوٹس لیتے ہوئے اہلِ نظر نے انھیں سراہا (ان ''اہلِ نظر'' میں مَیں بھی شامل تھا جس نے کالم ختم کرتے ہی اسے مبارک باد کا فون کیا)۔

صاحب اسلوب عطاء الحق قاسمی کالم کو تخلیق کی سطح پر لے آیا ہے۔ اس لیے وقتی، ہنگامی اور عارضی موضوعات و مسائل پر لکھے گئے اس کے کالموں کی عمر محض ۱۲ گھنٹے نہیں ہوتی بلکہ ہر دم تازہ اور سدا بہار تجربہ ہی ثابت ہوتی ہیں۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

بقول انتظار حسین ''عطاء الحق قاسمی کے کالم عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت کی طرز پر نہیں لکھے گئے بلکہ یہ اس فضا سے پھوٹتے ہیں جس فضا میں پطرس بخاری اور مشتاق احمد یوسفی کی تحریریں ابھر کر سامنے آتی ہیں''۔ ادب میں یہ خوش نصیبی صرف عطا کے حصے میں آئی ہے۔

''غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور'' سفر نامہ کے انداز میں نہیں بلکہ فلم کے ٹریلر کی مانند یہ چھوٹے چھوٹے flashes ہیں، چند سطروں میں بات ختم ہو جاتی ہے اور پھر آخری سطر...... پنچ لائن! نقطۂ عروج کا کام کرتی ہے۔ مگر یہ ٹریلر کی طرح محدود نہیں بلکہ ان flashes سے پاکستانی معاشرے کی سینما سکوپ فلم ترتیب پاتی ہے۔ کھڑکی توڑ فلم! میں، آپ ہم سب اس فلم کے کردار ہیں جبکہ عطاء الحق قاسمی نے اس فلم کا سکرپٹ تحریر کیا اور وہی کیمرہ مین اور ہدایت کار بھی ہے۔ ایک ایک پیراگراف کی یہ تحریریں مختصر افسانہ کی وحدت تاثر کی حامل ہیں اور اسی میں ان کی اثر انگیزی مضمر ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

(۱) ''لاہور کے عوام کو انگریز قوم کے ساتھ شدید محبت ہے اور وہ آج بھی انھیں یاد کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات خاصی باعثِ حیرت تھی کیونکہ انگریزوں نے ڈیڑھ سو برس تک یہاں کے لوگوں کو غلام بنائے رکھا ہے اور اس دوران ان پر سخت مظالم روا رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ انھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ انگریز کے دور کے بعض خانساموں اور خان بہادروں سے گفتگو ہوئی تو انھیں کہتے سنا کہ انگریز کا جواب نہیں تھا۔ ایک روز ایک گلی سے گزرتے ہوئے مَیں نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے بچے کو گود میں لیے ہلکارے دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ منہ سے کچھ بولے بھی جاتا تھا۔ مَیں جاننا چاہتا تھا کہ یہاں لوگ اپنے بچوں کو

بہلانے کے لیے ان کے ساتھ کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں، چنانچہ مَیں نے اپنے ہمراہی سے پوچھا کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ شخص اپنے بچے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ: ''آہا۔ میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے''۔

(۲) ''شادی کے موقع پر دولہا کی سالیاں اپنے برادران لا (Brother in law) کو جوتیاں اتار کر بیٹھنے پر زور دیتی ہیں چنانچہ جب وہ جوتیاں اتارتا ہے تو موقع پا کر یہ سالیاں جوتی غائب کر دیتی ہیں۔ بعد میں اس جوتی کی واپسی کے لیے دولہا کو منہ مانگی رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ جوتی چرانے کی یہ رسم شادی بیاہ کے علاوہ ہر جمعہ کو مسجدوں کے باہر بھی ادا کی جاتی ہے اور یہ رسم سالیاں ادا نہیں کرتیں۔ ممکن ہے یہ رسم سالے ادا کرتے ہوں تاہم مَیں نے اس ضمن میں کوئی تحقیق نہیں کی''۔

(۳) ''عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے کے باعث یہاں سالا ایک گھٹیا چیز اور بہنوئی ایک آسمانی چیز سمجھی جاتی ہے تاہم ہر شخص جو یہاں بہنوئی کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے وہ بیشتر صورتوں میں کسی نہ کسی کا سالا بھی ہوتا ہے چنانچہ یہاں ہر شخص کی آدھی زندگی بطور بہنوئی اور آدھی زندگی بطور سالے کے گزرتی ہے۔ ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہاں داماد کو تو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے لیکن گھر داماد کے ساتھ بڑا حقارت آمیز سلوک ہوتا ہے۔ واضح رہے داماد وہ ہوتا ہے جو لڑکی کو بیاہ کر لایا ہوتا ہے اور گھر داماد اسے کہتے ہیں جسے لڑکی بیاہ کر لاتی ہے''۔

(۴) ''لاہور کے بینکوں میں کیش کی وصولی کے دو طریقے ہیں۔ ایک چیک دے کر دوسرا کیشیئر کو پستول دکھا کر! دوسرا طریقہ عوام میں زیادہ مقبول ہے کیونکہ یہاں کے بینکوں میں چیک دے کر رقم کیش کرانے میں خاصا وقت لگتا ہے''۔

(۵) ''یہاں ''کزن'' کا رشتہ مجھے خاصا الجھا ہوا محسوس ہوا، ایک شخص نے اپنی ساتھی خاتون کا تعارف مجھ سے کرایا اور کہا: ''یہ میری کزن ہے''۔ اس وقت میرے پاس ایک اور شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرے کان میں کہا: ''پچھلے سال یہ میری کزن تھی!'' رشتے کی یہ 'روٹیشن' مَیں نے اس خطے میں دیکھی ہے۔ مشرق واقعی بہت پراسرار ہے''۔

(۶) ''ہمارے ہاں مغرب میں مکئی کی روٹی Bread ہوتی ہے۔ گندم کی روٹی ہوتی ہے، بیسن کی روٹی ہوتی ہے، چھان بورے کی روٹی ہوتی ہے لیکن پاکستان میں جس روٹی کا ذکر بہت عام ہے وہ ''عزت کی روٹی'' ہے، تاہم میں صرف اس کا ذکر ہی سنتا رہا کسی کو کھاتے نہیں دیکھا میں ایک دفعہ لاہور کے بازار حسن مجرا دیکھنے گیا جو طوائف مجرا کر رہی تھی وہ بہت خوبصورت تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا تم فلموں میں کام کیوں نہیں کرتیں؟ اس نے جواب دیا مجھے فلموں میں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ مجھے عزت کی روٹی دے رہا ہے''۔ اس پر مجھے ایک بار پھر تجسس ہوا کہ یہ عزت کی روٹی کیا چیز ہے؟ بہرحال پاکستان میں قیام کے دوران میں نے عزت کی روٹی کا ذکر رشوت خوروں، ہیروئن فروشوں، بردہ فروشوں اور ضمیر فروشوں سب کی زبان سے بار بار سنا یقیناً یہ کوئی بہت لذیذ چیز ہوگی تبھی تو سارے طبقے اس کا ذکر کرتے ہیں''۔

(۷) ''لاہوریئے بہت خوش طبع لوگ ہیں چنانچہ یہاں ایک ایسے ہی خوش طبع شخص سے میری ملاقات ہوئی، اس نے مجھے بتایا کہ اس کی دو کمزوریاں ہیں، ایک کمزوری عورت اور دوسری مردانہ کمزوری ہے۔ عجیب مسخرا شخص تھا''۔

(۸) ''ہم اہل مغرب لوٹے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کیونکہ یہ ہمارے ہاں نہیں ہوتا جبکہ پاکستان میں یہ برتن انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اس کے بغیر کوئی

ٹائلٹ مکمل نہیں سمجھا جاتا، ایک لاہوریا مجھے بتا رہا تھا کہ لوٹوں کے بغیر کوئی پارلیمنٹ بھی مکمل نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں وہ اپنی روایتی زندہ دلی کا مظاہرہ کررہا تھا ورنہ لوٹوں کا پارلیمنٹ سے کیا تعلق ہے؟''

(۹) ''پاکستان میں پاکستانی کلچر کے فروغ کیلئے بہت سے ادارے اور این جی اوز کام کررہی ہیں اس ضمن میں مجھے جو بات بہت اچھی لگی وہ یہ تھی کہ ان اداروں کے منتظمین کا کوئی تعلق پاکستانی کلچر سے نہیں تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کلچر میں پرورش پانے والا شخص اپنے کلچر کو اتنا نہیں سمجھ سکتا جتنا دور سے نظارہ کرنے والا شخص سمجھ سکتا ہے''۔

(۱۰) ''پاکستان میں دو کاروبار بڑے منافع بخش ہیں۔ ایک کاروبار بیوٹی پارلر اور دوسرا حکیموں کا ہے خصوصاً شادی کے دنوں میں یہ دونوں کاروبار عروج پر ہوتے ہیں۔ شادی والے روز دلہنیں بیوٹی پارلر اور دولہے، حکیموں کا رخ کرتے ہیں۔

(۱۱) ''پاکستان کا قومی لباس شلوار کرتا ہے، میرے لئے اپنے مغربی دوستوں کو شلوار کے ''کوائف'' سے پوری طرح آگاہ کرنا خاصا مشکل ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ پنجاب میں جو شلوار پہنی جاتی ہے اس پر بھی اگرچہ کافی کپڑا لگتا ہے مگر سندھ، بلوچستان اور سرحد کی شلوار کا طول وعرض تقریباً برطانیہ کے رقبے کے برابر ہے پاکستان کے رورل ایریاز میں دستار کا بھی بہت رواج ہے جسے عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے چنانچہ ان علاقوں کے جاگیردار اور وڈیرے انگریز کے زمانے سے لے کر آج تک ہر دور حکومت میں اپنی دستار کی حفاظت کرتے رہے۔ شلوار کی کبھی پرواہ نہیں کی''۔

(۱۲) ''پاکستان میں پیروں فقیروں کی بہت پذیرائی ہوتی ہے میں ایک پیر صاحب کے ڈیرے پر گیا۔ پیر صاحب بہت بڑے جاگیردار ہیں۔ ڈیرے پر ان کے

مریدوں کا جھمگٹا تھا جو والہانہ طور پر ان کے ہاتھ چوم رہا تھا۔ پیر صاحب اس دوران مجھ سے آکسن لہجے کی خوبصورت انگریزی میں گفتگو کرتے رہے اور اپنا بایاں ہاتھ انہوں نے بے نیازی سے مریدوں کے بوسے کے لیے ان کی طرف پھیلائے رکھا۔ جب مرید اس اظہار عقیدت سے فارغ ہوئے تو پیر صاحب نے ٹشو پیپر سے ہاتھ کے اس حصے کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا جہاں ان کے مرید طبع آزمائی کرتے رہے تھے واضح رہے یہ پیر صاحب اپنے مریدوں سے باہر کے حلقے میں بھی ہاتھ کی صفائی کیلئے مشہور ہیں''۔

(۱۳) ''میں جب پاکستان گیا ان دنوں وہاں وظائف کے ورد کا رجحان بہت زیادہ تھا خصوصاً خواتین کا زیادہ وقت وظائف ہی میں گزرتا تھا۔ اس دوران میری ملاقات ایک پاکستانی شوہر سے ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جب بھی گھر میں جاتا ہے اس کی بیوی پورے جسم کو چادر میں لپیٹے ہاتھ میں تسبیح پکڑے مصلے پر بیٹھی ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر عجب طرح کا نور ہوتا ہے پورے گھر میں تقدس کی فضا کچھ اس طرح چھائی ہوتی ہے کہ وہاں فرشتوں کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی بیوی کی پارسائی سے اس درجہ متاثر ہے کہ اب وہ صرف اس کے ہاتھ چومتا ہے اور وہ بھی اس احتیاط سے کہ بے ادبی کا احتمال تک نہ ہو''۔

(۱۴) ''پاکستان میں ایک بہت لذیذ پھل پایا جاتا ہے جسے آم کہتے ہیں اسے لالی پاپ کی طرح چوسا جاتا ہے اور چوسنے سے پہلے اسے ''پولا'' کرتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ اسے دونوں جانب سے آہستہ آہستہ دبایا جاتا ہے اور یوں اس کا رس چوسنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کئی لوگ آم پولا کر کے کسی دوسرے کو چوسنے کیلئے دے دیتے ہیں اور یہ قربانی ان کے ترقی کے رستے کھول دیتی

ہے۔ میں نے ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ ہر وقت خواتین کے جمگھٹے میں رہتے ہیں میں نے ایک لاہوریئے سے پوچھا کہ یہ صاحب کیا کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: ''کچھ نہیں صرف آم پولا کرتے ہیں''۔

عطاء الحق قاسمی نے طنز کی جو دیگ دم پخت کی یہ اس کے صرف چند چاول ہیں لیکن ان سے ہی ساری دیگ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میں بھی لاہوریا ہوں مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اردگرد پھیلے تضادات، بوالعجبیوں اور معصوم حماقتوں کا کبھی یوں نوٹس نہ لیا تھا۔ نوٹس لینے کیلئے ژرف نگاہی اور بیان کرنے کیلئے شگفتہ اسلوب درکار ہے جو ہر کسی کے پاس نہیں، اس لیے کہ ہر کوئی عطاء الحق قاسمی نہیں ہوتا۔

پیارے قارئین آیئے اور عطاء الحق قاسمی کے معیت میں غیر ملکی سیاح کی محدب شیشہ جیسی آنکھ سے اپنے پاکستان کو، اپنی عمارات کو، اپنی حماقتوں کو، اپنی رسموں کو، اپنے کلچر کو اور خود کو دیکھیے اور پھر ہنسیے اتنا ہنسیے کہ ہنستے ہنستے آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر

لاہور: گرم ترین دن/ ۲۰۰۷ء

غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور

ان دنوں جو پاکستانی ادیب بھی بیرون ملک جاتا ہے وہ واپسی پر سفرنامہ لکھتا ہے۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ جو غیر ملکی پاکستان آتے ہوں گے واپسی پر وہ بھی یقیناً ایک عدد سفرنامہ ضرور قلمبند کرتے ہوں گے۔ جس طرح ہمارے ہاں کے بعض سیاح کسی غیر ملک میں گزارے ہوئے چند گھنٹوں ہی سے اس کی پوری تہذیب اور تمدن کا کچا چٹھا کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں اسی طرح ممکن ہے بعض غیر ملکی سیاح بھی سپر ایکسپریس پر پاکستان کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اپنے قارئین کو پاکستانی عوام اور یہاں کی معاشرت کے بارے میں فیصلہ کن معلومات دے ڈالتے ہوں، سو میں نے چشم تصور میں ایک ایسے غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ ملاحظہ کیا ہے جس نے چند روز لاہور میں قیام کیا اور پھر اپنے تاثرات ایک کتابی صورت میں پیش کر دیے۔ اس ''سفرنامے'' کے کچھ حصے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

سرخ فوج سے سامنا:

جب میں نے لاہور ریلوے سٹیشن پر قدم رکھا تو سرخ فوج کے سپاہیوں نے مجھ پر دھاوا بول دیا۔ ان میں سے کوئی میرا دامن کھینچ رہا تھا اور کسی کا ہاتھ میرے گریبان پر تھا۔ ان کے چہرے زرد تھے، گال پچکے ہوئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنسی تھیں۔ ان میں بچے بھی تھے اور کمر خمیدہ بوڑھے بھی۔ ان کے جسم لاغر تھے اور آنکھوں میں بے چارگی تھی۔ پیشتر اس کے کہ میں عجلت میں کوئی فیصلہ کر بیٹھتا۔ میری نظر سرخ وردیوں

ہی میں ملبوس کچھ دوسرے افراد پر پڑی جو دیگر مسافروں کا سامان لڑکھڑاتی ٹانگوں کے ساتھ سر پر اٹھائے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ تب مَیں نے جانا کہ یہ سوشلسٹ نہیں بلکہ محنت کش ہیں۔ ان محنت کشوں کی قمیض پر ''فی پھیرا آٹھ آنے'' لکھا تھا۔ بعد میں ایک پاکستانی دوست نے مجھے بتایا کہ انہیں استعمال کرنے والے لیڈروں کی قمیضوں پر ''فی پھیرا---- ایک غیر ملکی پھیرا'' لکھا ہوتا ہے۔

ایک حیرت انگیز رسم:

میرے لیے یہ امر باعثِ حیرت تھا کہ پاکستان میں عورتوں اور مردوں سے کہیں زیادہ مردوں اور مردوں کو اختلاط کی آزادی حاصل ہے۔ کیونکہ مَیں نے بے شمار نوجوانوں کو دیکھا جو ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ اسی طرح مَیں نے مردوں کو عورتوں سے زیادہ ''سیکسی'' لباس میں ملبوس پایا۔ انہوں نے سکرٹ قسم کی کوئی چیز پہنی ہوئی تھی جسے وہ اتنا اوپر اٹھا کر چلتے تھے کہ وہ منی سکرٹ بلکہ مائیکرو منی سکرٹ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ مَیں نے لوگوں کو برسرِ عام کسی ایسی دیوار کی طرف منہ کر کے جس پر کسی گدھے کی تصویر بنی ہوئی تھی، دھواں ''دھار'' حرکت کرتے ہوئے بھی پایا۔ کئی ایک لوگوں کو اس کام سے فراغت کے بعد اپنے محرک ہاتھ کے ساتھ ادھر ادھر ٹہلتے بھی دیکھا۔ اگلے روز مَیں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی ''شارع عام پر فحش حرکات کرتے ہوئے گرفتار......یقیناً وہ یہی لوگ ہوں گے۔

خوشحال اور ماڈرن معاشرہ:

اپنے ملک سے روانہ ہوتے وقت مَیں نے اپنے ایک پاکستانی صنعت کار دوست کو اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا، چنانچہ شام کو وہ مجھے ہوٹل سے اپنے بنگلے میں لے گیا جہاں اس نے میرے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ یہاں عورتیں، مردوں کے

شانہ بشانہ مے نوشی میں مشغول تھیں اور اپنے دوستوں کے بازوؤں میں جھول رہی تھیں۔ مَیں بھی ان پر مسرت لمحات سے پوری طرح فیضیاب ہوا۔ یہ بیس کنال میں واقع بارہ بیڈ روم کا بنگلہ تھا جس میں صرف میرا دوست اور اس کی خوبصورت بیوی رہتی تھی۔ یہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ پاکستان کی تہذیبی اور معاشی پسماندگی کے بارے میں ہمارے پریس کا تمام پراپیگنڈہ بے بنیاد ہے، کیونکہ مَیں نے جو کچھ دیکھا اس کے مطابق پاکستان تہذیبی لحاظ سے کسی صورت بھی یورپ یا امریکہ سے کم نہیں ہے اور دولت کی فراوانی میں تو وہ غالباً ان ملکوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہے، کیونکہ ہمارے ہاں عموماً دو یا تین بیڈ روم کے گھر ہوتے ہیں...... بیشک ایک لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس ''فرسٹ ہینڈ انفارمیشن'' ہو......!

بے مثال آزادیٔ صحافت:

لاہور میں میری ملاقات ایک صحافی سے بھی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ پاکستان میں صحافت پوری طرح آزاد ہے، چنانچہ ثبوت میں اس نے ڈھیر سارے رسائل و جرائد دکھائے۔ ایک اخبار نے کسی دفتر کے ایک کلرک کی بدعنوانیوں کے خلاف زبردست اداریہ تحریر کیا تھا اور لکھا تھا کہ اگر اسے فی الفور تبدیل نہ کیا گیا تو اس سے حکومت کی بے پناہ مقبولیت متاثر ہونے کا امکان ہے۔ ایک اور اخبار میں شائع شدہ ایک کارٹون میں کارپوریشن کا نلکا دکھایا گیا تھا جس میں سے پانی کی بجائے ہوا کا اخراج ہو رہا تھا اور یوں کارپوریشن حکام کی نااہلی پر مؤثر تنقید کی گئی تھی۔ ایک اور اخبار کے کالم نویس نے اس لاوارث شخص کا نوحہ لکھا تھا جو سردیوں کی رات میں فٹ پاتھ پر ٹھٹھر کر مر گیا تھا اور پھر وہ علاقے کی پولیس پر بری طرح برسا تھا جس نے سردیوں کی رات میں اس شخص کو فٹ پاتھ پر سونے دیا۔ اسی طرح میرے ایک صحافی دوست نے کچھ ایسے

رسائل بھی دکھائے جن میں اور تو اور خود پاکستان کے قیام کے خلاف کھل کر اپنے مؤقف کا اظہار کیا گیا تھا۔ ایسے جرائد بھی میری نظروں سے گزرے جن میں بالکل عریاں تصویریں چھپی تھیں اور جن کی تحریریں واضح طور پر جنسی اشتعال کے زمرے میں آتی تھیں۔ اگر میں یہ سب رسائل اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ پاکستان میں پریس آزاد نہیں ہے لیکن یہ مسرت کا مقام ہے کہ یہاں پریس کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ میں پاکستانی قوم کو اس پر مبارکباد کہتا ہوں، کیونکہ اس نے یہ آزادیاں یقیناً بڑی جدوجہد کے بعد حاصل کی ہوں گی۔

شادی کی رسوم:

مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ پاکستان میں شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کا راضی ہونا کافی نہیں، بلکہ ان کے والدین کا راضی ہونا ضروری ہے، تاہم وہ اس سلسلے میں اولاد کی مرضی ضرور دریافت کرتے ہیں۔ اگر لڑکا لڑکی ''ہاں'' کر دیں تو یہ شادی ہو جاتی ہے اور اگر ''نہ'' کہیں...... تو بھی ہو جاتی ہے۔ مجھے یہاں ایک شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ بارات میں بے شمار لوگ تھے جو پیدل چل رہے تھے اور دولہا گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ دولہے کو گھوڑے پر بٹھانے کی رسم میرے لیے ناقابلِ فہم تھی ممکن ہے اس کا تعلق دولہے کی ذہنی سطح یا ''ہارس پاور'' وغیرہ سے ہو۔ بارات میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے سر پر کچھ صندوق اٹھائے ہوئے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ اس میں دلہن وغیرہ کے لیے قیمتی پارچہ جات ہیں جو دلہن والوں کو دکھا کر دولہا واپس اپنے گھر لے جائے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان کپڑوں کو ''وری'' کے کپڑے کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ ''وری'' سن کر میں بہت چونکا کیونکہ ہمارے ہاں بھی یہ لفظ موجود ہے اور انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جن معنوں میں پاکستان میں

استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں وری (WORRY) کا مطلب ''پریشانی'' ہے۔ اور جن کپڑوں کو یہاں ''وری'' کہا جاتا ہے وہ بھی پریشانی ہی کے زمرے میں آتے ہیں کیونکہ انہیں بلاوجہ اٹھا کر دلہن کے گھر لے جانا پڑتا ہے جبکہ بالآخر انہیں واپس دلہا کے گھر ہی آنا ہوتا ہے۔

ٹرانسپورٹ کے قدیم ذرائع:

مجھے لاہور اس لحاظ سے بھی اچھا لگا کہ یہاں کے لوگ اپنی بے پناہ خوشحالی اور حد درجہ ماڈرن ہونے کے باوجود بعض قدیم روایات کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ اس میں سرفہرست ٹرانسپورٹ کے ذرائع آتے ہیں جن میں زمانہ قدیم سے اب تک سرمو تبدیلی نہیں کی گئی، چنانچہ مجھے یہاں ایک سواری پر بیٹھنے کا اتفاق ہوا جس کے تین پہیے تھے۔ اگلی نشست پر صرف ڈرائیور بیٹھتا تھا اور پچھلی نشست دو مسافروں کے لیے تھی۔ اسے رکشہ کہا جاتا ہے، اس میں سفر کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اگلی نشست صرف ڈرائیور ہی کیلئے کیوں مخصوص کی گئی ہے۔ اس تیز رفتار اور ہجوم میں ''زگ زیگ'' (ZIG ZAG) بناتی ہوئی سواری کی اگلی نشست پر دراصل بیٹھ بھی وہی سکتا ہے جو کسی سرکس کا انتہائی ماہر فنکار ہو۔ شیر کے منہ میں گردن ڈال سکتا ہو اور کپڑوں کو آگ لگا کر پانچ ہزار فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگانے کی ہمت رکھتا ہو۔ اسی طرح ایک لاہوری دوست مجھے ایک پنجابی فلم ''ہیر رانجھا'' دکھانے کے لیے اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس کے ایک سین میں ہیر کو اس کا چچا مارتا ہے جس کے باعث ہیر کے ماتھے سے خون بہنے لگتا ہے۔ اس پر اسے فوراً ایک لکڑی کی بنائی ہوئی ڈولی میں بٹھا دیا جاتا ہے جسے چار افراد کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور یہ لوگ یقیناً اسے ہسپتال لے گئے ہوں گے۔ میرے لیے یہ ایمبولینس بہت (FASCINATING) تھی۔ ہم یورپ

والے اپنی قدیم روایات کو بالکل ترک کرتے جا رہے ہیں جو کوئی اچھی بات نہیں۔

شرمیلی دوشیزائیں:

لاہور میں قیام کے دوران پاکستان کی شہری تہذیب کا اندازہ تو مجھے اس ضیافت ہی میں ہو گیا تھا جہاں مَیں نے لڑکیوں کو مے نوشی کرتے اور چیک ٹو چیک (CHEEK TO CHEEK) ڈانس کرتے دیکھا تھا اور ان لمحات میں مَیں نے جانا تھا کہ مشرق کے بارے میں تمام کہانیاں، کہانیاں ہی ہیں۔ نیز یہ کہ اگرچہ مشرق، مشرق ہے اور مغرب مغرب لیکن پاکستان میں یہ بہر حال ایک دوسرے سے بہت اچھی طرح بغل گیر ہیں، تاہم میری خواہش تھی کہ مَیں دیہاتی کلچر کے بارے میں بھی کچھ جانوں، کیونکہ شہر اور دیہات کی تہذیب میں ہر جگہ عموماً خاصا فرق پایا جاتا ہے، چونکہ میرے پاس وقت کم تھا اور یوں میرے لیے دیہات میں جانا ممکن نہ تھا، اس لیے ایک پاکستانی شناسا کے مشورے پر مَیں ایک پنجابی فلم دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ یہ فیصلہ مَیں نے اس لیے کیا تھا کہ فلمیں کسی ملک یا علاقے کی تہذیب کا صحیح عکاس ہوتی ہیں۔ فلم کے دوران مجھے ایک بار پھر اس امر پر بے پایاں خوشی ہوئی کہ پنجاب کے دیہات معاشی لحاظ سے نہ صرف یہ کہ پسماندہ نہیں ہیں بلکہ تہذیبی لحاظ سے انہیں پنجاب کے شہروں پر بھی برتری حاصل ہے۔ معاشی لحاظ سے دیہی معاشرہ مجھے یوں خوشحال محسوس ہوا کہ فلم میں مزارعین کی بیٹیوں کو زرق برق لباس اور قیمتی میک اپ سے آراستہ حالت میں گھر کے کام کاج کرتے دکھایا گیا تھا اور ان کے ماڈرن ہونے نیز تمام TABOOS وغیرہ سے آزاد ہونے کا ثبوت اس امر سے ملتا تھا کہ وہ بھرے میلے میں اپنے ''بوائے فرینڈ'' کے گلے میں بانہیں ڈال کر پھرتی تھیں، سیٹیاں بجاتی تھیں اور ڈانس کے دوران ہر سیکنڈ بعد اپنے بوائے فرینڈ سے چمٹ جاتی تھیں۔ مجھے یورپ

اور امریکہ کی نسبت پنجاب کے ان دیہات میں ...... آزادیٔ نسواں (LIB WOMEN) کی تحریک زیادہ مضبوط محسوس ہوئی، کیونکہ شادی بیاہ کے سلسلے میں اپنی مرضی منوانے کے لیے وہ اپنے والدین کے سامنے پر جوش تقریر کرتی دکھائی دیں۔ تاہم مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ پنجاب کے دیہات کی یہ بھرے بھرے جسم والی آزاد خیال لڑکیاں کھیتوں میں ''ملک شیک'' قسم کے ڈانس کرنے، نیم عریاں لباس پہننے، والدین کے سامنے دھڑلے سے اپنی محبت اور تعلقات کا اعلان کرنے اور حیلے بہانے سے جسم کے ایک ایک عضو کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اچانک کسی سین میں دوپٹہ اپنے سر پر رکھ لیتی تھیں اور شرمانا شروع کر دیتی تھیں۔ یہ شاید اس لیے کہ مشرق بہر حال مشرق ہے اور شرمانا یہاں کی ''سپیشلٹی'' (SPECIALITY) ہے۔ چنانچہ اس کے مظاہرے کے لیے فلم میں کوئی نہ کوئی سچوایشن بہر حال نکالنا پڑتی ہے! گڈ شو بڈیز!

نظریاتی پختگی:

مجھے یہاں کے لوگوں میں ایک قابلِ تعریف چیز ان کا اپنے نظریہ میں پختہ ہونا بھی لگی۔ ان کے دلوں میں برائی کے لیے شدید نفرت اور نیکی کے لیے محبت ہی محبت موجزن ہے۔ ایک سمگلر سے میری ملاقات ہوئی، مَیں جتنی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا، وہ مسلسل اس امر پر نوحہ کناں رہا کہ لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ ایک نائٹ کلب کی بیلے ڈانسر نے میرے سامنے معاشرے میں بڑھتی ہوئی جنسی انارکی سے اظہار بیزاری کیا۔ ایک گراں فروش تاجر نے کہا کہ رزق حلال سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ ہر نئی حکومت کے قیام پر پارٹیاں بدلنے والا ایک سیاسی رہنما اس امر پر زور دے رہا تھا کہ اصولوں پر کسی صورت ''کمپرومائز'' نہیں ہو سکتا۔ ایک بڑا جاگیردار اپنے ہی مزارعین کی حالت پر آنسو بہا رہا تھا۔ میرے لیے یہ سب کچھ بہت

خوشگوار تھا۔ ہم یورپین لوگ جو کرتے ہیں اسے درست سمجھتے ہیں لیکن پاکستانی عوام گو برائی کو برائی سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں تاہم نیکی کے لیے ان کے دل میں خیر سگالی کے گہرے جذبات موجود ہیں۔ برائی کو ختم کرنے کے لیے اپنی اصلاح کوئی بڑا کام نہیں، اصل کام موقع بہ موقع نیکی کا جھنڈا بلند کرنا ہے اور یہاں کے عوام اس فریضے سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

انگریز کا بچہ:

لاہور کے عوام کو انگریز قوم کے ساتھ شدید محبت ہے اور وہ آج بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات خاصی باعثِ حیرت تھی کیونکہ انگریزوں نے ڈیڑھ سو برس تک یہاں کے لوگوں کو غلام بنائے رکھا ہے اور اس دوران ان پر سخت مظالم روا رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ انہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ انگریز کے دور کے بعض خانساموں اور خان بہادروں سے گفتگو ہوئی تو انہیں کہتے سنا کہ انگریز کا جواب نہیں تھا۔ ایک روز ایک گلی سے گزرتے ہوئے مَیں نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے بچے کو گود میں لیے ہلکارے دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ منہ سے کچھ بولے بھی جاتا تھا۔ مَیں جاننا چاہتا تھا کہ یہاں لوگ اپنے بچوں کو بہلانے کے لیے ان کے ساتھ کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں، چنانچہ مَیں نے اپنے ہمراہی سے پوچھا کہ یہ شخص کیا کر رہا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ شخص اپنے بچے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ:

''آہا- میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے''۔

مہمان نوازی:

ابھی مَیں نے جس ہمراہی کا ذکر کیا ہے وہ مجھے لاہور میوزیم کے قریب ملا تھا اور مَیں نے اس سے راستہ دریافت کیا تھا لیکن وہ ساتھ چل پڑا کہ میرے پاس خاصا

وقت ہے۔ مَیں تمہیں لاہور دکھاؤں گا، چنانچہ یہ نوجوان مجھے شاہی قلعہ، شاہی مسجد، شالیمار گارڈن اور لاہور کے دیگر تاریخی مقامات دکھانے لے گیا۔ راستے میں اس نے مجھے لاہور کی بعض خاص چیزیں مثلاً فالودہ، لسی، کھیلاں پتیسے، سنگھاڑے، ملوک، کچک، کانجی، مرونڈے اور نجانے کیا کیا کچھ کھلایا۔ بعد میں وہ مجھے اپنے گھر لے گیا جو اندرون شہر واقع تھا۔ اس نے مجھے باہر کے کمرے میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں اور پھر مجھے یوں لگا کہ تھوڑی دیر بعد کوئی ذرا سا دروازے کا پٹ کھولتا ہے اور اس دوران کوئی سیاہ آنکھ اندر کو جھانکتی نظر آتی ہے اور پھر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہلکی ہلکی مترنم ہنسی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خواتین ہیں جو اپنے گھر میں ایک غیر ملکی مہمان کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ خواتین مجھے چوری چھپے کیوں دیکھ رہی ہیں اندر کیوں نہیں آ جاتیں۔ گلبرگ میں تو ایسا نہیں تھا، مگر بعد میں مجھے پتہ چلا کہ لاہور میں بعض علاقے ایسے بھی ہیں جو ابھی تک بہت آرتھوڈاکس ہیں۔ اس دوران وہ نوجوان کمرے میں آیا اور معذرت کرنے لگا کہ اسے کچھ دیر ہو گئی کیونکہ وہ چائے وغیرہ کے انتظامات میں مصروف تھا۔ کچھ ہی دیر بعد گھر کے اندرونی حصے سے مختلف لوگوں کی آوازیں مختلف کونوں سے آنے لگیں۔ وہ غالباً ایک دوسرے کو چائے کے انتظامات کے سلسلے میں مدد کے لیے پکار رہے تھے، جس کے باعث ایک خاصی ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک بچہ چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا، اس ٹرے میں صرف چائے ہی نہ تھی بلکہ کھانے پینے کا اور بھی بہت سا سامان تھا۔ اس نے ''ٹکیز'' (بسکٹ) کی پلیٹ میری طرف بڑھائی لیکن مَیں نے ''تھینک یُو'' کہہ کر انکار میں سر ہلا دیا، کیونکہ اب میری طبیعت متلانے لگی تھی لیکن جتنا بھی انکار کرتا تھا اتنا ہی اس کا اصرار بڑھتا چلا جاتا تھا۔ پتہ چلا کہ یہاں اصرار کے ساتھ کھلانے

کومہمان نوازی کہا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں اسے (DYSENTRY) (خرابیِ معدہ) کہتے ہیں۔ واپسی پر اس نوجوان نے مجھے اتنی ہی گرمجوشی سے الوداع کہا اور چلتے چلتے درخواست کی کہ اگر اپنے ملک واپسی پر مَیں اس کے لیے ورک پرمٹ ارسال کرسکوں تو وہ بہت ممنون ہوگا۔ اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا جو مَیں نے اپنی ڈائری میں درج کرلیا جہاں مَیں نے ورک پرمٹ کے خواہشمند دیگر بے شمار مہمان نواز پاکستانیوں کے ایڈریس پہلے سے نوٹ کیے ہوئے تھے۔

ایک حکیم سے ملاقات:

اس نوجوان کے گھر سے واپسی پر میرے معدے میں خاصی گڑبڑ تھی، چنانچہ مَیں نے راستے میں ایک حکیم کی دکان دیکھی تو اندر داخل ہوگیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے ایک مریض نے بتایا کہ حکیم صاحب ملک کے بہت بڑے طبیب ہیں۔ مَیں علاج کے لیے کسی ڈاکٹر کی دکان پر بھی جاسکتا تھا لیکن مَیں نے طبِ مشرق کے کمالات کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، چنانچہ مَیں نے خود کو یہاں پا کر بہت (THRILL) محسوس کی۔ حکیم صاحب کے کمرے میں چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں اور وہ ان کے درمیان میں عینک چہرے پر چڑھائے ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے میری نبض دیکھی اور اس دوران آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر غور وفکر کی گہری لکیریں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا ہاتھ نبض پر سے اٹھایا۔ آنکھیں کھولیں اور پوچھا: ''عربوں کی طرف سے تیل کا ہتھیار استعمال کرنے سے آپ کی معیشت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟'' مَیں اس سوال پر بہت سٹپٹایا کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ میری مرض کے بارے میں مجھ سے پوچھیں گے۔ جب مَیں نے دانستہ طور پر اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تو انہوں نے دوسرا ہاتھ دکھانے کو کہا اور ایک بار پھر کچھ دیر کے لیے

گہرے غور وفکر میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد انہوں نے ہاتھ اٹھایا۔ عینک اتار کر میز پر رکھی اور میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگے: ''کیا انگولا کی صورت حال میں تبدیلی کا کوئی امکان ہے؟'' اس بار میں سخت جھنجھلایا اور مَیں نے بالکل چپ سادھ لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ روایات کے مطابق دراصل طبِ مشرق سے وابستہ افراد صرف طبیب ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ سیاست دان، سماجی کارکن، شاعر اور ادیب بھی ہوتے ہیں، چنانچہ حکیم صاحب کے ہاں جو ہزاروں کتابیں نظر آرہی تھیں ان میں سے چند ایک طب کے موضوع پر بھی تھیں۔ باقی کتابیں دیگر فنون سے متعلق تھیں۔ ایک نازک سا فرق یہ بھی معلوم ہوا کہ ان اطبا کے نامور آباؤ اجداد اپنے پیشے میں مکمل مہارت اور تمام تر دلچسپی لینے کے بعد کچھ وقت سیاست، معاشرت اور شعر وادب کے لیے بھی نکالتے تھے جبکہ ان کے پیروکار زندگی کے تمام شعبوں میں سرگرم حصہ لینے کے بعد اگر کچھ وقت بچتا ہے تو وہ طبابت پر صرف کرتے ہیں۔

وچولے:

جس طرح جائیداد کی خرید وفروخت کے لیے ہمارے ہاں مختلف ایجنسیاں کام کرتی ہیں اسی طرح مشرق میں باقاعدہ ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو جائیداد کی خرید وفروخت کے ساتھ ساتھ شادی کے لیے مناسب رشتوں کے ضمن میں اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ ان ''وچولوں'' کے پاس معاشرے کے تمام طبقوں سے متعلق لوگوں کے نام پتے اور ان کی تصویریں موجود ہوتی ہیں، چنانچہ یہ گاہکوں کو باقاعدہ رجسٹرڈ کرنے کے بعد انہیں لڑکے اور لڑکی کے بارے میں مکمل کوائف مہیا کرتے ہیں اور بوقتِ ضرورت تصویر بھی مہیا کردیتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی کچھ ایسے ادارے موجود ہیں، مگر واضح رہے وہ شادی بیاہ سے متعلق نہیں ہیں۔

اخباروں میں اشتہارات:

اس کے علاوہ کئی لڑکیوں کے والدین ذاتی طور پر بھی اخبار میں اشتہار دیتے ہیں جس میں دیگر کوائف کے علاوہ لڑکی کی ذاتی جائیداد کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہوتی ہے۔اس طرح لڑکے کے والدین کی طرف سے جو اشتہارات شائع ہوتے ہیں ان میں ذات پات اور عقیدہ کے تعین کے علاوہ اس امر پر بھی زور دیا گیا ہوتا ہے کہ لڑکا اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا ہے یا یہ کہ وہ کاروبار کا متمنی ہے چنانچہ صرف ایسے حضرات رجوع کریں جو اس سلسلے میں اس کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

سلامی:

مجھے یہاں ایک شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ بڑی پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا تاہم مَیں نے دیکھا کہ کھانے سے قبل لوگ ایک ایک کر کے دولہا کے پاس جاتے تھے اور اُسے کچھ روپے پیش کرتے تھے۔ دولہا کے ساتھ ایک شخص بیٹھا تھا جو یہ رقم گنتا اور ایک کاپی میں درج کرتا چلا جاتا۔ مجھے یہ رسم بہت اچھی لگی کہ ہر کوئی اپنے کھانے کا بل خود ادا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے ''ڈچ سسٹم'' کہا جاتا ہے جبکہ یہاں کے لوگ اسے ''سلامی'' کہتے ہیں۔

بارات پر سنگ زنی:

جس رسم کا مَیں ذکر کرنے لگا ہوں مجھے وہ خود دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا البتہ ایک پاکستانی دوست نے مجھے بتایا کہ یہاں بعض دیہات میں جب لڑکے والے بارات لے کر دلہن کے گھر پہنچتے ہیں تو دلہن کی رشتے دار عورتیں مکان کی چھت پر سے انہیں خوب اور ہر طرح کی گالیاں دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انہیں پتھر بھی مارتی ہیں

لیکن دولہا اور باراتی اس کا برا نہیں مانتے۔ مجھے یہ رسم اچھی نہیں لگی۔ ہمارے ہاں بھی بعض لوگ شادی کے ''انسٹی ٹیوشن'' کے خلاف ہیں اور وہ اس امر کو ایک غیر فطری فعل سمجھتے ہیں کہ ایک عورت اپنی تمام عمر ایک مرد کے ساتھ اور ایک مرد اپنی تمام عمر ایک عورت کے ساتھ صرف کر دے، تاہم وہ شادی کے انسٹی ٹیوشن کے خلاف اپنا نکتہ نظر اس جارحانہ انداز میں پیش نہیں کرتے جس طرح پنجاب کے ان دیہات میں کیا جاتا ہے۔

دولہا کے ساتھ ہنسی مذاق:

لاہور میں جس شادی میں شرکت کا مجھے اتفاق ہوا تھا اس میں ایک رسم مَیں نے یہ بھی دیکھی کہ شادی کے اگلے روز جب دولہا اپنی دلہن کو اس کے والدین کے گھر لے کر جاتا ہے تو دولہا کی سالیاں اس کے ساتھ بہت ہنسی مذاق کرتی ہیں۔ مثلاً وہ بغیر فوم کے پلنگ پر صرف چادر بچھا کر دولہا کو اس پر بیٹھنے کے لیے کہتی ہیں اور دولہا لاعلمی کی بنا پر بیٹھ جاتا ہے۔ میرے دوست کے ساتھ بھی یہی مذاق کیا گیا تھا اور کل مجھے اس کا خط موصول ہوا ہے جس میں اس نے بتایا کہ وہ ابھی تک ہسپتال میں ہی ہے۔

جوتی چرانے کی رسم:

اس موقع پر دولہا کی سالیاں اپنے برادران لا (Brother in law) کو جوتیاں اتار کر بیٹھنے پر زور دیتی ہیں چنانچہ جب وہ جوتیاں اتارتا ہے تو موقع پا کر یہ سالیاں جوتی غائب کر دیتی ہیں۔ بعد میں اس جوتی کی واپسی کے لیے دولہا کو منہ مانگی رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ جوتی چرانے کی یہ رسم شادی بیاہ کے علاوہ ہر جمعہ کو مسجدوں کے باہر بھی ادا کی جاتی ہے اور یہ رسم سالیاں ادا نہیں کرتیں۔ ممکن ہے کہ یہ رسم سالے ادا کرتے ہوں تاہم مَیں نے اس ضمن میں کوئی تحقیق نہیں کی۔

حاضرین کو چھوہارے مارنا:

یہاں شادی کے موقع پر ایک رسم یہ بھی ہے کہ نکاح سے فراغت کے بعد دولہا کے کوئی عزیز محفل میں موجود حاضرین کو چھوہارے مارتے ہیں۔ اسے یہاں چھوہارے لٹانا کہا جاتا ہے۔ ایک چھوہارا میری ناک کو بھی لگا جس کے باعث ناک کئی دن تک سوجی رہی۔ چھوہارے کے بارے میں وضاحت کر دوں کہ جب کھجور پڑی پڑی سوکھ جائے تو یہاں کے لوگ اسے چھوہارا کہنے لگتے ہیں۔ نیز یہ کہ چھوہارے کی شکل صرف چھوہارے سے ملتی ہے۔

پیسوں کی بارش:

ایک رسم یہ بھی ہے کہ گھوڑے یا کار میں سوار دولہا کے کوئی عزیز چینج سے بھرا ہوا ایک بیگ لے کر بارات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور موقع بہ موقع بیگ میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالتے ہیں اور پھر پوری قوت کے ساتھ اسے دے مارتے ہیں۔ یہ رسم ان بچوں کو خوش کرنے کے لیے نبھائی جاتی ہے جو صرف پیسے لوٹنے کے لیے بارات کے آگے آگے چل رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ اگر کسی بارات میں ایسا نہ ہو تو یہ بچے چند قدم ساتھ چلنے کے بعد ''اوئے اوئے'' کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کا مطلب یہاں باراتیوں کی ''ناک کٹ جانا'' سمجھا جاتا ہے۔ یہ ناک کٹ جانے کی وضاحت مَیں نہیں کر سکتا کیونکہ مَیں خود نہیں سمجھ پایا کہ بیٹھے بٹھائے ناک کیسے کٹ سکتی ہے حالانکہ ناک کٹنے کے زیادہ چانسز دھات کے یہ سکے باراتیوں کے منہ پر مارنے میں پوشیدہ ہیں۔ بہرحال پیسے لٹانے کی اس رسم سے بچے اور باراتی سبھی خوش ہوتے ہیں۔ اس فعل کے دوران اگر کسی کو تشویش ہوتی ہے وہ یا تو وہ کار کے مالک کو ہوتی ہے جس کی ونڈ سکرین ہر بار خطرے میں پڑ جاتی ہے اور یا پھر

کار کی عدم موجودگی میں خود گھوڑے کو ہوتی ہے جو متعدد بار دھات کے ان سکوں کی زد میں آتا ہے۔ اس صورت میں اس کے قریب کھڑے افراد حفظِ ماتقدم کے طور پر خود بخود ایک دولتی کے فاصلے پر ہو جاتے ہیں۔

آئینہ دکھانا:

یہاں شادی سے پہلے دولہا دلہن نے چونکہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھا ہوتا لہٰذا انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع فراہم کرنے کے لیے ایک دلچسپ طریقہ برتا جاتا ہے دولہا کو عورتوں کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے اور وہاں اسے دلہن کے ساتھ بٹھا دیا جاتا ہے۔ یہاں دونوں اگرچہ ساتھ ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں تاہم وہ ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ دلہن نے ایک تو گھونگھٹ نکالا ہوتا ہے اور دوسرے اس نے گردن جھکائی ہوتی ہے۔ اس موقع پر ان کے پاؤں میں ایک آئینہ لا کر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ کم از کم ایک دوسرے کی شکل دیکھ سکیں، کیونکہ انہوں نے تمام عمر ایک دوسرے کے ساتھ گزارنا ہوتی ہے، چنانچہ وہ اس آئینے میں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں اور پھر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ تمام عمر ایک دوسرے کے ساتھ بسر کریں گے۔ اس فیصلے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ رسم ادا کرنے سے قبل بزرگوں نے ان کا نکاح پڑھا دیا ہوتا ہے۔

عورت پاؤں کی جوتی؟:

مَیں نے لاہور میں بیشتر لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ پیسہ ہاتھ کی میل اور عورت پاؤں کی جوتی ہے تاہم حیرت کی بات یہ ہے کہ مَیں نے یہاں لوگوں کی کثیر تعداد کو اس جوتی اور میل کے لیے ذلیل وخوار ہوتے دیکھا ہے۔ یہ میل تو کچھ لوگوں کے ہاتھ آ جاتی ہے مگر بیشتر اس کے لیے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔ البتہ شادی کی بدولت جوتی

سب کا مقدر بنتی ہے بلکہ کئی ایک تو جوتی کی بجائے جوتیوں کی خواہش کرتے ہیں اور یہ خواہش اس وقت پوری ہو جاتی ہے جب وہ مزید شادیاں کرتے ہیں۔

سالا اور بہنوئی:

عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے کے باعث یہاں سالا ایک گھٹیا چیز اور بہنوئی ایک آسمانی چیز سمجھی جاتی ہے تاہم ہر شخص جو یہاں بہنوئی کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے وہ بیشتر صورتوں میں کسی نہ کسی کا سالا بھی ہوتا ہے چنانچہ یہاں ہر شخص کی آدھی زندگی بطور بہنوئی اور آدھی زندگی بطور سالے کے گزرتی ہے۔ ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہاں داماد کو تو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے لیکن گھر داماد کے ساتھ بڑا حقارت آمیز سلوک ہوتا ہے۔ واضح رہے داماد وہ ہوتا ہے جو لڑکی کو بیاہ کر لایا ہوتا ہے اور گھر داماد اسے کہتے ہیں جسے لڑکی بیاہ کر لاتی ہے۔

گھر کی رانی:

میں نے ابھی عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے کا ذکر کیا تھا مگر یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس قسم کے خیالات صرف اَن پڑھ لوگوں میں پائے جاتے ہیں، کیونکہ یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ عورت کے متعلق اس قسم کے خیالات نہیں رکھتا وہ اسے گھر کی رانی سمجھتے ہیں اور اسے پوری پوری عزت دیتے ہیں، تاہم اس رانی کے فرائض میں جھاڑو دینا، برتن صاف کرنا، پوتڑے دھونا، کھانا پکانا، جھاڑ پونچھ کرنا اور شوہر، نیز اس کے ماں باپ، بہن بھائی، رشتے دار اور دوستوں کے نازنخرے اٹھانا ہے۔ باقی رہے ''راجہ'' کے فرائض سو وہ سب کچھ کرتا ہے جو راجے مہاراجے کرتے ہیں۔

موت کی قبل از وقت اطلاع:

انسانی زندگی میں خوشیاں اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں، چنانچہ لاہور میں قیام کے

دوران جہاں مجھے شادی بیاہ کی تقریبات میں شرکت کا موقع ملا وہاں میں نے موت وغیرہ کی رسومات میں بھی شرکت کی اور سچی بات تو یہ ہے کہ پراسرار مشرق کی باقی چیزوں کی طرح یہ رسومات بھی مجھے ''تھرلنگ'' (THRILLING) محسوس ہوئیں۔ مثلاً مغرب والوں کے لیے یہ اطلاع شاید ناقابلِ یقین ہو کہ یہاں وفات پانے والے ہر شخص کو اپنی موت کے بارے میں قبل از وقت علم ہو جاتا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے بعض مرنے والوں کے لواحقین کی گفتگو سے ملا۔ ان میں سے ہر ایک یہی بتاتا تھا کہ مرحوم نے مرنے سے چند گھنٹے یا چند روز قبل کچھ ایسی باتیں کہیں جن سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ وہ عنقریب فوت ہونے والے ہیں، تاہم میری ملاقات یہاں صحت مند نوجوانوں سے بھی ہوئی اور ان کا محبوب مشغلہ بھی صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک موت ہی کے بارے میں گفتگو کرنا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ زندگی سے تمام تر مایوسی کے باوجود یہ لوگ بہر حال اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر ہی فوت ہوتے ہیں اور موت وغیرہ کے بارے میں ان کی گفتگو محض ٹائم پاس کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

بین ڈالنے کی رسم:

دیہات کے بیشتر اور شہر کے بعض گھرانوں میں ایک رسم یہ ہے کہ فوتیدگی کی صورت میں برادری کی خواتین اپنے گھر سے مرنے والے کے گھر تک ننگے پاؤں بین کرتی آتی ہیں۔ گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے ان کی آہ وزاری بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ گھر کی دہلیز میں قدم رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی کہرام مچ جاتا ہے۔ اس موقع پر وہ باری باری مرنے والے کے قریبی لواحقین کو جپھا ڈال کر رونے جیسی آوازیں نکالتی ہیں۔ وہ اپنی خشک آنکھیں چھپانے کے لیے لمبا گھونگھٹ نکال لیتی ہیں تاہم اگر رونے کرلانے کے دوران ان کی خشک آنکھیں نظر آ جائیں تو بھی یہ کوئی معیوب امر نہیں گردانا جاتا،

کیونکہ دونوں پارٹیوں کے درمیان یہ چیز ''انڈرسٹڈ'' (UNDERSTOOD) ہوتی ہے۔

مرحوم کس طرح فوت ہوئے تھے؟

تعزیت کے لیے آنے والے مرنے والے کے کسی قریبی عزیز سے پہلے تعزیت کے کلمات کہتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر کوئی یہ سوال پوچھتا ہے کہ مرحوم کس طرح فوت ہوئے تھے؟ دراصل یہ سوال تعزیت کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے، چنانچہ مرحوم کا وہ عزیز وفات سے تین چار روز قبل کے واقعات خصوصاً مرنے سے چند گھنٹے قبل کے واقعات پوری تفصیل سے سناتا ہے اور کسی ایک خاص مقام پر پہنچ کر دھاڑیں مارنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوئی دوسرا شخص تعزیت کے لیے آتا ہے اور پوچھتا ہے ''مرحوم کس طرح فوت ہوئے تھے؟'' چنانچہ وہ یہ داستانِ غم ایک بار پھر پوری تفصیل سے سناتا ہے اور مقررہ وقت پر دھاڑیں مارنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک تعزیت کرنے والے آتے رہتے ہیں اور پوچھتے رہتے ہیں کہ مرحوم آخر فوت کس طرح ہوئے تھے؟ حتیٰ کہ مرحوم کا وہ عزیز نڈھال ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہر تعزیت کرنے والے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بتاتا ہے کہ مرحوم دراصل اس طرح فوت ہوئے تھے!!

کندھا دینا:

یہاں میت کو ایمبولینس کی بجائے چارپائی پر ڈال کر قبرستان تک لے جایا جاتا ہے۔ چنانچہ باری باری چار آدمی چارپائی اٹھاتے ہیں اور اسے یہاں ''کندھا دینا'' کہا جاتا ہے کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کندھا دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے اور پھر کچھ دیر بعد وہ منتظر ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص آگے بڑھے اور اس کی جگہ کندھا دے مگر

اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی، چنانچہ اسے ڈگمگاتی ٹانگوں کے ساتھ اس وقت تک یہ سفر طے کرنا پڑتا ہے جب تک کوئی دوسرا شخص اس کی دستگیری کو نہیں پہنچتا۔ یہ سفر اس صورت میں زیادہ طویل محسوس ہونے لگتا ہے جب مرحوم کی شخصیت زیادہ وزنی ہو اور کندھا دینے والے کا قد باقی تین کندھا دینے والوں سے ہم آہنگ نہ ہو!

مُردوں کو فرائی کرنا:

کسی محفل میں میری ملاقات ایک سوگوار شخص سے ہوئی جس کے والد کو فوت ہوئے کچھ عرصہ گزرا تھا۔ وہ اپنے والد کی وفات سے متعلق گفتگو کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا ''پورے نومن گھی خرچ ہوا ہے''۔ اس سے مَیں نے اندازہ لگایا کہ شاید یہاں مُردوں کو تل کے دفن کیا جاتا ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ میرا یہ اندازہ درست نہیں تھا کیونکہ متذکرہ شخص کا نومن گھی چہلم کی رسومات کی ادائیگی کے سلسلے میں خرچ ہوا تھا۔

قُل اور چہلم کی رسومات:

قل اور چہلم کی رسومات کو یہاں مذہبی اہمیت حاصل ہے۔ قل کی رسم وفات کے تیسرے روز ادا کی جاتی ہے جبکہ چہلم کی تقریب چالیس دن پورے ہونے کے بعد منعقد کی جاتی ہے۔ اس روز مرحوم کے عزیز واقارب جمع ہوتے ہیں اور مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے پلاؤ، زردہ اور قورمہ وغیرہ پکایا جاتا ہے تا کہ غربا و مساکین میں تقسیم کیا جا سکے۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے کہ ''خیرات کا آغاز گھر ہی سے کیا جاتا ہے''۔ یہ محاورہ غالباً یہاں بولی جانے والی زبان میں بھی موجود ہے کیونکہ یہ پلاؤ، قورمہ اور زردہ وغیرہ مرحوم کے عزیز واقارب کھاتے ہیں اور اس روز مرحوم کے گھر میں جشن کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس دوران صرف دو تین چہرے سوگوار نظر آتے ہیں جو مرحوم کے قریب ترین عزیزوں میں سے ہوتے ہیں۔

بوٹی کی تلاش:

جہلم کی ایک تقریب میں مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا میں نے دیکھا کہ لوگ یہاں کھانے پر جھپٹ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ ٹھٹھا مخول بھی جاری تھا۔ کھانے کے اختتام پر لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ان میں سے ایک گروہ کے چہروں پر خاصا کھچاؤ تھا اور وہ رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ مَیں نے ہمراہی سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا گفتگو کر رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ یہ کھانے کی گھٹیا کوالٹی پر بڑبڑا رہے ہیں اور کہہ رہے کہ شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا اور اس میں بوٹی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔ نیز یہ کہ یہ برادری کے لوگ ہیں اور اُنہیں ''شریک'' کہا جاتا ہے۔

تعزیتی وفود:

مرحوم کے لواحقین سے تعزیت کے لیے آنے والے لوگ صرف وفات سے تین چار روز تک ہی نہیں آتے بلکہ یہ سلسلہ پورا سال جاری رہتا ہے۔ بسا اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ مرحوم کے لواحقین مرحوم کو بھول چکے ہوتے ہیں اور نئے سرے سے زندگی کی خوشیوں میں شریک ہو گئے ہوتے ہیں کہ کوئی تعزیت کنندہ اچانک کسی روز گھر کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ معذرت کرتا ہے کہ وہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر اتنا عرصہ تعزیت کے لیے حاضر نہ ہو سکا اور پھر اس کے بعد وہ مرحوم کے بارے میں رقت آمیز گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ اس پر ایک بار پھر کہرام مچ جاتا ہے اور جب آہ و بکا کا یہ سلسلہ عروج پر پہنچنے لگتا ہے تو وہ اجازت طلب کرتا ہے کیونکہ اس نے ایک جگہ شادی کی مبارک باد کے لیے بھی جانا ہوتا ہے۔

قیام وطعام کا معقول بندوبست:

مرحوم کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں آنے والے عزیز و اقارب ان رسومات سے فراغت کے بعد اپنے اپنے گھروں کو نہیں لوٹتے بلکہ ان میں سے کئی ایک مرحوم کے لواحقین کو تسلی وغیرہ دینے کیلئے مہینہ در مہینہ اہل و عیال کے ساتھ وہیں قیام کرتے ہیں۔ اس دوران ان کی پوری پوری مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ مجھے اہلِ مشرق کی یہی چیز پسند ہے کہ ایک تو وہ مہمان نواز بہت ہیں اور اس کے لیے موقع محل کی کوئی قید نہیں اور دوسرے ان میں باہمی محبت، غمگساری اور ایک دوسرے کا درد بٹانے کے جذبات بہت قوی ہیں۔ ان دونوں جذبات کا بھرپور اظہار مَیں نے موت وغیرہ کے موقع پر بطور خاص دیکھا ہے۔

بے اعتباری:

لاہور میں قیام کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں لوگ بعض صورتوں میں مرحوم کی میت غائب کرا دیتے ہیں تاہم رفع شک سے بچنے کے لیے اگلے روز اخبارات میں یہ خبر شائع کرا دی جاتی ہے کہ مرحوم کو دفنا دیا گیا ہے چنانچہ بیشتر لوگ اس الزام سے بچنے کے لیے بطور خاص خبر کے آخر میں یہ جملہ ضرور شامل کراتے ہیں کہ ''مرحوم کو سینکڑوں افراد کی موجودگی میں سپردِ خاک کر دیا گیا''۔ ممکن ہے خبر میں دفناتے وقت سینکڑوں افراد کی ''موجودگی'' پر زور دینے میں کوئی اور مصلحت پوشیدہ ہو تاہم دھیان اس خدشے کی طرف ضرور جاتا ہے جس کا مَیں نے ابھی ذکر کیا ہے

جنازوں کے مہمانِ خصوصی:

موت وغیرہ کے سلسلے میں اخباری خبروں سے مجھے ایک اندازہ یہ بھی ہوا کہ یہاں عام تقریبات کے علاوہ جنازوں میں بھی مہمانِ خصوصی کا معقول بندوبست کیا جاتا

ہے اور یہ ''چیف گیسٹ'' مرنے والے کے سٹیٹس کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ خبر میں دیگر تفصیلات بیان کرنے کے بعد آخر میں اس مہمان خصوصی کا بطور خاص ذکر ہوتا ہے کہ جنازے میں فلاں وزیر، جج یا افسر نے بھی شرکت کی۔ مرنے والا اگر زیادہ بڑا آدمی ہو تو مہمانِ خصوصی ایک سے زیادہ ہو جاتے ہیں چنانچہ اس صورت میں خبر میں بتایا جاتا ہے کہ جنازے میں معززینِ شہر کے علاوہ وزراء، ججوں اور افسروں نے شرکت کی۔ مجھے اس نوع کی خبروں میں صرف لفظ ''علاوہ'' کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔

ایک مرحوم کی مقبولیت:

یہاں مجھے ایک ایسے جنازے میں شرکت کا اتفاق ہوا جس میں مرحوم کے بیٹے اور دیگر ورثا دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ لوگ انہیں دلاسا دیتے تھے مگر ان کے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آتے تھے۔ مَیں نے زندگی میں بہت سوگوار خاندان دیکھے ہیں لیکن اس قدر دلدوز آہیں اس سے پہلے کبھی نہیں سنیں۔ حیرت انگیز امر یہ تھا کہ آہ و بکا کرنے والوں میں صرف مرحوم کے ورثا ہی شامل نہ تھے بلکہ گرد و نواح کے دکاندار بھی اس ماتم میں برابر کے شریک تھے اپنوں اور غیروں میں اس قدر مقبولیت بلکہ محبوبیت کا یہ مظاہرہ یقیناً میرے لیے قابلِ رشک تھا تاہم ایک شخص نے مجھے بتایا کہ دراصل مرحوم بہت مقروض ہو کر فوت ہوئے ہیں۔

کلمۂ شہادت:

یہاں جنازوں میں ایک رسم یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ کندھا دینے والا ہر شخص زور سے ''کلمۂ شہادت'' کا نعرہ لگاتا ہے اور ایسا کرتے وقت جواب کی کوئی توقع نہیں رکھتا۔ کندھا دینے کے بعد وہ جنازے کے پیچھے چلنے والے احباب میں دوبارہ شامل ہو جاتا ہے جسے وہ بیچ ہی میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پھر ان میں سے کوئی دوسرا شخص کندھا دینے

کے لیے ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے احباب سے اجازت چاہتا ہے اور ''کلمۂ شہادت'' کہہ کر کندھا دینے لگتا ہے۔ ایک جنازے میں لوگ حسبِ معمول مصروفِ گفتگو تھے۔ ایک پرجوش شخص یک جماعتی حکومت کی حمایت میں بڑے شد و مد سے گفتگو کر رہا تھا۔ ''ون پارٹی گورنمنٹ ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔ ہم لوگ جمہوریت افورڈ نہیں کر سکتے اور تم دیکھنا یہاں یک جماعتی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ اس وقت تم سب وہی کہو گے جو مَیں کہہ رہا ہوں۔ ''کلمۂ شہادت!''

زندہ درگور:

مجھے قبرستان جانے کا اتفاق بھی ہوا اور ان قبرستانوں کی حالت دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ یہاں لوگ موت سے اتنے خوفزدہ کیوں ہیں؟ تاہم صاحبِ حیثیت لوگ یہاں بھی اپنے لیے خصوصی بندوبست کروا لیتے ہیں، چنانچہ مَیں نے یہاں ایک ایک کنال کے رقبہ میں چھ سات فٹ کی قبریں بھی دیکھی ہیں۔ بعض قبروں میں مَیں نے روشن دان بھی دیکھے اور ان کے ساتھ وسیع و عریض لان بھی پایا، جہاں رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ اکثر قبروں پر مَیں نے مرحوم کے نام کے ساتھ ان کا عہدہ بھی درج پایا۔ یہ سب اہتمام دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے مرحوم فوت نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے صرف کوٹھی تبدیل کر لی ہے!

تشخیص کا کمال:

لاہور میں قیام کے دوران جب ایک بار مَیں بیمار ہوا تو طب مشرق کی شہرت سن کر مَیں ایک طبیب کے پاس گیا تھا اور مایوس ہوا تھا۔ اس کا احوال مَیں بیان کر چکا ہوں چنانچہ جب دوسری بار مَیں بیمار ہوا تو مَیں نے طبیب کی بجائے ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کیا۔ ڈاکٹر نے زبان نکلوا کر ''غوں غاں'' کروانے کے بعد مجھے نسخہ لکھ دیا۔ اس

نسخے میں کم از کم دس پندرہ دوائیوں کے نام درج تھے مَیں نے اپنے ایک شناسا میڈیکل ریپ کو یہ نسخہ دکھایا اور ایک بخار کے لیے اتنی ساری دوائیاں تجویز کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ نسخہ تجویز کرتے ہوئے خاصی احتیاط سے کام لیا ہے اور تمام ممکنہ امراض کا سدباب کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس نسخے میں ٹی بی، پیچش، اسہال، لقوہ، بواسیر اور دیگر امراض کے لیے ایک ایک دوا تجویز کر دی ہے تاکہ ان میں سے جس بیماری کا بھی آپ شکار ہوں وہ رفع ہو جائے۔ آخر میں احتیاطاً انہوں نے خلل دماغ کی بھی دوا لکھ دی ہے کہ جسمانی نظام بہت پیچیدہ چیز ہے ممکن ہے آپ کو بیماری ویماری کچھ نہ ہو بلکہ محض خلل دماغ کے باعث محسوس کرتے ہوں کہ آپ بیمار ہیں۔

جنگی تربیت:

مَیں نے محسوس کیا ہے کہ لاہور کے عوام بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی تربیت پر بہت دھیان دیتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہاں ایک بار اپنے گھر پر مدعو کیا تو مجھے اس کا بخوبی احساس ہوا۔ ڈرائنگ روم میں میزبان کا چار سالہ بچہ بھی موجود تھا بہت کیوٹ، مَیں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگا۔ میزبان نے مجھے بتایا کہ یہ بہت شریر ہے اور اس کا ثبوت دینے کے لیے انہوں نے بچے کو چکارا۔ "منے! انکل کو چپت مارو"۔ اور پیشتر اس کے مَیں اس ضمن میں حفاظتی اقدامات کرتا، منے نے ہاتھ گھما دیا۔ میری عینک ٹوٹ کر نیچے جا گری۔ اس پر میزبان ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے اور منے کو گود میں اُٹھا کر چومنے لگے۔ یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو بہادر دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے شروع ہی سے ان کی تربیت جنگی بنیادوں پر کرتے ہیں۔

مقفّیٰ و مسجع گالیاں:

ایک عرصے تک یہ خیال عام رہا ہے کہ گالی دینا ایک ناپسندیدہ حرکت ہے چنانچہ آج تک وکٹورین عہد میں زندہ رہنے والے ثقہ لوگ ہمیشہ اس سے بدکتے تھے حالانکہ کتھارسز کے لیے یہ ایک انتہائی ضروری فعل ہے۔ اب نہ صرف یہ کہ یورپ میں یہ "ٹیبو" (TABOO) توڑ دیا گیا ہے بلکہ لاہور کے گلی کوچوں میں خواص و عام کی محفلوں میں مَیں نے اس رجحان کو خاصا مضبوط پایا ہے۔ اگر مَیں یہ کہوں تو زیادہ مناسب ہو گا کہ اہالیانِ لاہور نے اس صنفِ نازک کو اپنی معراج تک پہنچا دیا ہے۔ اس محفل میں جس کا ذکر مَیں نے ابھی کیا ہے میزبان نے اپنے بیٹے کی زبانی بہت پیاری پیاری گالیاں سنوائیں۔ آخر میں انہوں نے کہا: "منے! ایک گالی انکل کو بھی دو، وہی والی!" اور منے نے جو گالی دی، میزبان سے اس کا ترجمہ سن کر مَیں عش عش کر اٹھا۔ اس میں تہہ در تہہ معانی پوشیدہ تھے اور اس کی زد میں مخاطب کی سات پشتیں آتی تھیں۔

بعض نامانوس لفظ:

لاہور میں قیام کے دوران دو ایک لفظ مَیں نے ایسے بھی سنے جو میرے لیے بالکل نئے تھے۔ خود مقامی لوگوں نے جب مجھے سمجھانے کی غرض سے ان لفظوں کو انگریزی میں ادا کرنا چاہا تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان میں ایک لفظ "غیرت" بھی تھا۔ یہاں کے لوگ اپنی گفتگو میں یہ لفظ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اس موضوع پر یہاں بے شمار فلمیں بھی بنی ہیں اور سنا ہے اس مسئلے پر آئے روز قتل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ مَیں نے جب ایک دوست سے اس لفظ کا مطلب جاننے کی کوشش کی تو اس نے ذہن پر زور دے کر کہا ریسپیکٹ (RESPECT) مگر دوسرے ہی لمحے کہنے لگا۔ نہیں نہیں اس کا ترجمہ ریسپیکٹ نہیں۔ ریسپیکٹ کا مطلب تو عزت ہوتا

ہے۔ "غیرت کچھ اور چیز ہے!" پھر اسنے "غیرت" کے متبادل دو اور لفظ "آنر" اور "موڈیسٹی" وغیرہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالے مگر ہر بار خود ہی انہیں غلط قرار دے ڈالا۔ میری الجھن بھی بڑھتی جا رہی تھی اور خود وہ بھی خاصا پریشان نظر آنے لگا تھا۔ بالآخر کہنے لگا: "اگر تم اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ ملوث دیکھو تو اس موقع پر تمہیں کیا آئے گا!" مَیں نے جواب دیا "غصہ" جز بز ہو کر بولا "غیرت نہیں آئے گی"۔ مَیں نے جھنجھلا کر کہا "وہ کیا ہوتی ہے؟" "یہی تو مَیں جاننا چاہتا ہوں"۔ اس پر اس نے فوراً ڈکشنری منگوائی اور جلدی جلدی ورق الٹنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے ڈکشنری بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور کہا: "تمہاری ڈکشنری میں غیرت کا لفظ ہی موجود نہیں ہے۔ یہ قصہ چھوڑ دو!" وہ کہتا ہے یہ کوئی مقامی مسئلہ ہے اور ہم مغرب والے اس سے واقف نہیں ہیں۔ یہ یقیناً کوئی دلچسپ چیز ہو گی۔

لباس:

مَیں نے یہاں لوگوں کو ملکی اور غیر ملکی دونوں لباسوں میں ملبوس دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ جو پڑھے لکھے لوگ ہیں وہ غیر ملکی لباس پہنتے ہیں اور جو اَن پڑھ ہیں وہ اپنے ملک کے لباس کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرے طبقے کے لوگوں میں دھوتی ایک بہت مقبول لباس ہے۔ یہ ایک ان سلے کپڑے پر مشتمل ہوتا ہے جسے لوگ اپنی کمر کے گرد باندھ لیتے ہیں۔ کئی لوگ رات کو سوتے وقت بھی دھوتی باندھ کر سوتے ہیں اور بہت ہی گہری نیند سوتے ہیں۔ مَیں ایک دوست کے گھر مہمان گیا تو اس نے سوتے وقت مجھے بھی ایک دھوتی باندھنے کے لیے دی، جب صبح میری آنکھ کھلی تو یہ دھوتی مَیں نے اوپر لی ہوئی تھی!!!

تھان اور تھانہ:

مقامی زبان میں "تھان" کپڑے کے "اجتماع" کے علاوہ اس جگہ کو بھی کہا جاتا ہے جہاں جانور باندھے جاتے ہیں اور "تھانہ" پولیس سٹیشن کو کہا جاتا ہے۔ ایک محقق نے مجھے بتایا کہ یہ تھان تھانہ ہی سے نکلا کیونکہ تھان میں جانور اور تھانے میں انسان باندھے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ تھانے سے بہت زیادہ خوفزدہ نظر آئے۔ چنانچہ اس کے بارے میں بہت سے مقولے بھی یہاں مشہور ہیں۔ ایک تھانیدار سے اس مسئلے پر میری بات چیت ہوئی تو اس نے عوام کے تمام الزامات کو بے بنیاد قرار دیا اور کہا: "ہم عوام کے خادم ہیں وہ تو ہم سے یونہی خوفزدہ ہیں۔ آپ میرے ساتھ تھانے چلیے وہاں جا کر آپ اگر میری باتوں کے قائل نہ ہو جائیں تو کہیے"۔ مَیں تو ساتھ چلنے کو تیار تھا مگر لوگوں نے مجھے روک دیا۔ انہوں نے کہا: "وہاں جا کر آپ واقعی قائل ہو جائیں گے"۔

بجلی کی آمد و رفت:

پاکستان میں قیام کے دوران میرے لیے سب سے دلچسپ تجربہ بجلی کی آمد و رفت کا تھا۔ لوگ بیٹھے بیٹھے چلانے لگتے تھے "چلی گئی" اور کبھی ایک دم پکار اٹھتے تھے "آ گئی" یہ دلچسپ ڈرامہ دن میں کئی بار کھیلا جاتا تھا اور مجھے معلوم ہوا کہ اس ڈرامے کی پروڈکشن اور ڈائرکشن "واپڈا" کے سپرد ہے۔ "واپڈا ایک ادارہ ہے جس کے ذمے بجلی کی فراہمی کا فریضہ ہے تاہم وہ عوام کی تفریح طبع کے لیے اس قسم کے چھوٹے موٹے پروگرام بھی پیش کرتا رہتا ہے۔ نیویارک میں برس ہا برس کے بعد ایک دفعہ چند گھنٹوں کے لیے بجلی چلی گئی تھی جس سے تمام سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں اور اعداد وشمار کے مطابق اس برس بچوں کی پیدائش کی شرح میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔ سنا ہے کہ

پاکستان میں آبادی کی صورت حال بھی تشویشناک ہے۔

حیرت انگیز:

پاکستان کے متعلق میرا تاثر یہ تھا کہ یہ صنعتی طور پر بھی خاصا پسماندہ ملک ہے، چنانچہ ابھی تک اس معاملے میں پوری طرح خود کفیل نہیں ہو سکا مگر لاہور میں چند روزہ قیام کے دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ پاکستان میں صنعتوں کا جال بچھا ہوا ہے بلکہ یہاں ایسی ایسی صنعتیں موجود ہیں جو ابھی تک تمام تر ترقی کے باوجود یورپ وغیرہ میں بھی قائم نہیں ہو سکیں۔ مثلاً ایک دوست نے ان کی تفصیل بتاتے ہوئے صنعت اشتقاق، صنعت شبہ اشتقاق اور صنعت طباق وغیرہ کا نام لیا۔ ان بڑی صنعتوں سے منسلک اس نے سمال انڈسٹریز کی تفصیل بھی بتائی جو ایک اور صنعت، صنعت تجنیس کے تحت قائم ہیں، مثلاً تجنیس تام، تجنیس تام مماثل اور تجنیس تام متوفی وغیرہ۔ میرے لیے یہ بالکل نئی صنعتیں تھیں، چنانچہ مَیں نے اپنے دوست سے اس ضمن میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ صنعت اشتقاق سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا جمع ہونا ہے جو ایک ہی مادہ یا مصدر سے مشتق ہوں۔ اسی طرح اس نے دیگر صنعتوں کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا، لیکن اس کے باوجود مَیں ان صنعتوں کی اصل نوعیت نہ سمجھ سکا تاہم مَیں نے اس سے پوچھا کہ ان صنعتوں کی بدولت کتنے لوگوں کو روزگار حاصل ہوا ہے، تو دوست نے کہا کہ ان صنعتوں سے ہزاروں شاعر منسلک ہیں مگر بے روزگار ہیں۔ مجھے اپنے اس دوست کی یہ بات بھی چنداں سمجھ میں نہ آئی۔ میرا یہ دوست خود بھی شاعر تھا۔

شو بزنس:

میرا یہی شاعر دوست مجھے ایک محفل میں لے گیا جہاں بے شمار لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک سٹیج تھا جہاں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی شخص اٹھتا اور

راسٹرم پر آ کر گانا سناتا، یہ گانا آلاتِ موسیقی کے بغیر تھا، مگر گانے والا بہت لہک لہک کر گاتا تھا اور بسا اوقات تو اس کے حلق کی رگیں پھول کر پھٹنے کے قریب ہو جاتی تھیں، کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اسے ''بک اپ'' کرتے تھے۔ جواباً وہ شخص جلدی جلدی اپنا دایاں ہاتھ ہلانے لگتا تھا۔ وہ یہ ہاتھ اتنی تیزی سے ہلاتا تھا لگتا تھا اس کی کہنی میں کمانی فٹ ہے، لوگ اس کی پرفارمنس سے بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ میرے دوست نے بتایا اس قسم کی محفلوں کو یہاں ''مشاعرہ'' کہا جاتا ہے اور سٹیج پر جو شخص پھدک رہا ہے اسے شاعر کہتے ہیں۔ میرے دوست نے یہ بھی بتایا کہ ایسی محفلوں میں شرکت کے لیے عموماً کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کیونکہ ہمارے ہاں شو بزنس سے منسلک افراد خاصے بھاری معاوضے لیتے ہیں اور ان کے شو میں شرکت کے لیے ٹکٹ خاصی مہنگی ہوتی ہے۔

آخری آدمی:

مَیں یہاں ایک ریستوران میں بھی گیا جس کے متعلق میرے دوست نے بتایا کہ یہاں زیادہ تر وہ ادیب شاعر اور دانشور بیٹھتے ہیں جو ادب کی جدید قدروں کے علمبردار ہیں۔ انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کرنے کے خلاف ہیں اور بین الاقوامیت کے پرچارک ہیں۔ نیز یہ کہ دنیا میں امن، محبت اور رواداری کا دور دورہ چاہتے ہیں، مگر مَیں نے دیکھا کہ وہ خود مختلف گروہوں کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے بلکہ ایک میز پر بیٹھنے والے بھی ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے لگتے تھے۔ ہم یہاں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ اب رات ہو چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے جانا شروع ہو گئے تھے، ہماری میز پر صرف دو ادیب رہ گئے تھے اور وہ میرے دوست کے ساتھ انتہائی محبت اور یگانگت کے رویے کا اظہار کر رہے تھے۔ مجھے ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ سی محسوس

ہونے لگی تھی، چنانچہ مَیں نے اپنے دوست سے واپس چلنے کے لیے کہا۔ یہ سن کر وہ اپنا منہ میرے کان کے قریب لایا اور آہستگی سے بولا: ''تم صورت حال کو نہیں سمجھتے اس میز سے جو اٹھ کر جاتا ہے باقی لوگ اس کے خلاف گفتگو شروع کر دیتے ہیں چنانچہ مَیں نے تہیہ کیا ہے کہ مَیں آج سب سے آخر میں یہاں سے جاؤں گا''۔

پتنگیں لوٹنے کا شوق:

یہاں کے لوگوں کو پتنگیں لوٹنے کا بہت شوق ہے۔ وہ بیسیوں فٹ بلند چھتوں کی پتلی اور کمزور سی منڈیر پر ''ڈھانگا'' (پتنگ لوٹنے میں آسانی پیدا کرنے والا ایک آلہ) لیے کھڑے رہتے ہیں اور پھر کٹی ہوئی پتنگ دیکھ کر وہ اس پر اتنے فریفتہ ہوتے ہیں کہ ان کی آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے اور وہ اس کا پیچھا کرتے کرتے بلندی سے نیچے سڑک پر آن گرتے ہیں۔ مگر یہ پتنگیں لوٹنے کا شوق ایسا ہے کہ اگلے روز ان کے پسماندگان ایک بار پھر ہاتھ میں ''ڈھانگا'' لیے وہیں کھڑے نظر آتے ہیں۔ مَیں نے سنا ہے کہ لوٹ مار کا یہ شوق یہاں کے حکمرانوں میں بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ وہ بھی ہاتھوں میں ''ڈھانگا'' اٹھائے بلند و بالا چھتوں کی منڈیروں پر کھڑے رہتے ہیں اور جب وہ اس کے نتیجے میں کسی المناک حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں تو اگلے روز ان کے پسماندگان کٹی ہوئی پتنگیں لوٹنے کے شوق میں ایک بار پھر اسی منڈیر پر ہاتھ میں ''ڈھانگا'' لیے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

تیسری دنیا:

لاہور میں قیام کے دوران مَیں نے سیاستدانوں اور عوام کو تیسری دنیا کے مسئلے پر بہت گرما گرم بحثیں کرتے دیکھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنے خشک موضوع پر بھی مَیں نے ان کی روایتی زندہ دلی میں کوئی کمی محسوس نہیں کی۔ ایک رہنما نے تیسری دنیا

کے نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے جلسہ عام میں کہا۔ ''ایک دنیا تو یہ ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ دوسری دنیا وہ ہے جہاں ہم نے جانا ہے۔ مَیں پوچھتا ہوں بیچ میں یہ تیسری دنیا کہاں سے آ گئی؟'' اگلے روز اسی مقام پر حریف جماعت کے رہنما نے پورے جوش و خروش سے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ پوچھتے ہیں تیسری دنیا کیا ہے؟ اوئے سنو! مَیں بتاتا ہوں ایک دنیا وہ ہے جہاں ہم رہتے ہیں، دوسری دنیا وہ ہے جہاں ہم نے جانا ہے اور تیسری دنیا وہ ہے جہاں انہوں نے جانا ہے!''

پچھلا دروازہ:

یہاں رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی دکانیں شام تک بند رہتی ہیں۔ ایک روز شہر میں گھومتے پھرتے مجھے بھوک محسوس ہوئی تو مَیں نے اپنے ایک مقامی دوست کو جو اس وقت میرے ہمراہ تھا، اس ہنگامی صورت حال سے آگاہ کیا، چنانچہ وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا اور ایک بند دکان کے باہر آویزاں گتے پر لکھی عبارت پڑھنے لگا۔ مَیں نے پوچھا کیا لکھا ہے؟ بولا لکھا ہے۔ ''رمضان المبارک کے احترام میں ہوٹل بند ہے...... کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے تشریف لائیں چنانچہ ہم کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے داخل ہوئے اور کھانا کھا کر پچھلے دروازے ہی سے باہر آ گئے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں پچھلے دروازے کا استعمال بہت عام ہے۔ لوگ سیاست اور اقتدار میں بھی پچھلے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور پھر ایک روز ان کی واپسی بھی پچھلے دروازے ہی سے ہوتی ہے!

مقبول ترین آلہ موسیقی:

رمضان کے مہینے میں مَیں نے ایک اور عجیب و غریب چیز کا مشاہدہ کیا۔ یہاں کچھ لوگ آدھی رات کو گردنوں میں ڈھول لٹکائے اور ہاتھوں میں چمٹا پکڑے گھروں

سے نکل کر سڑکوں پر آ جاتے ہیں اور خوب اودھم مچاتے ہیں۔ جن کے پاس ڈھول نہیں ہوتا وہ کوئی ٹین وغیرہ کھڑکاتے ہیں۔ مَیں نے ابھی ڈھول (ڈرم) اور چمٹے کا ذکر کیا تھا تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر یہ بتاتا چلوں کہ چمٹا یہاں کا ایک مقبول ترین آلہ موسیقی ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ یہ ساز پاکستان کے قریباً ہر گھر میں پایا جاتا ہے اور خاصا کثیرالاستعمال بھی ہے۔ کئی مائیں اس سے بچوں کو پیٹنے کا کام بھی لیتی ہیں اور کچھ لوگوں کو تو مَیں نے اس آلے سے دہکتے ہوئے کوئلے بھی پکڑتے دیکھا ہے۔

ابنارمل لوگ:

یہاں مَیں نے سینکڑوں لوگوں سے بھرے ہوئے ایک ہال میں دیکھا کہ سٹیج پر دو شخص چوکڑی مار کر بیٹھے تھے اور وہ لوگوں کو طبلے کی تھاپ پر آہ و زاری کر کے دکھاتے تھے۔ ان بیچاروں کے چہرے کرب سے کھنچے ہوئے تھے اور وہ حلق سے ایسی آوازیں نکال رہے تھے جیسی آوازیں بکرے کو ذبح کرتے وقت اس کے حلق سے نکلتی ہیں۔ میرے لیے زیادہ افسوسناک امر یہ تھا کہ ان اذیت پسند ناظرین کے لیے یہ آہ و بکا مثل موسیقی کے تھی اور وہ اسے ''پکا راگ'' کا نام دیتے تھے۔ مجھے یہ لوگ خاصے ابنارمل لگے!

دیدہ دلیری:

یہاں ایک دانشور نے ایک دوست کے حوالے سے اپنی ایک کتاب مجھے عنایت کی اور کہا کہ اس اردو دان دوست کی مدد سے مَیں اسے انگریزی میں ترجمہ کر دوں۔ اس کھاتے پیتے دانشور نے متذکرہ کام کے لیے مجھے خاصی معقول رقم کی پیشکش کی اور ظاہر ہے مَیں نے یہ پیشکش قبول کر لی کیونکہ مجھے پردیس میں پیسے کی ضرورت تھی،

مگر چند ابواب کے مطالعے کے بعد مَیں نے یہ کتاب بصد معذرت واپس کر دی اور اپنے اس معاون دوست کو بتایا کہ اس کتاب کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کتاب پہلے ہی انگریزی سے ترجمہ شدہ ہے۔ مَیں متذکرہ دانشور کی اس دیدہ دلیری پر بہت پریشان تھا، تاہم مجھے بتایا گیا کہ ایسی صورت حال کو یہاں ''توارد'' کہا جاتا ہے۔

جینے کا قرینہ:

میرے نزدیک لاہوریوں کی شخصیت کا خوبصورت پہلو یہ ہے کہ ان کے چہروں پر ہمیشہ مسکراہٹ کے پھول کھلے رہتے ہیں۔ مَیں نے انہیں کبھی منہ بسورے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ہنستے، مسکراتے نظر آتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی اس قومی خصوصیت کو بڑے سے بڑے سانحے پر بھی برقرار رکھتے ہیں۔ مَیں نے یہاں کے ایک اخبار میں کسی بڑے المیے پر ایک احتجاجی جلوس کی تصویر دیکھی جس کے نیچے یہ کیپشن درج تھا کہ ''غیظ وغضب سے بھرے ہوئے عوام اپنے غم وغصہ کا اظہار کر رہے ہیں''۔ اور تصویر میں جو لوگ نظر آ رہے تھے ان میں سے بیشتر کیمرے کی طرف منہ کر کے ہنس رہے تھے۔ جس قوم کے افراد بڑے سے بڑے صدمے کو یوں ہنسی خوشی برداشت کرنے کا قرینہ جانتے ہوں اسے کبھی زوال نہیں آ سکتا۔

نظریاتی جھگڑا:

ایلوس پریسلے اتنا مقبول فنکار تھا کہ ایک بار وہ اپنی سفید کار باہر کھڑی کر کے شاپنگ کے لیے ایک دکان میں گیا اور جب وہ واپس آیا تو اس کی پرستار لڑکیوں نے اس کی سفید کار چوم چوم کر لپ اسٹک سے سرخ کر دی تھی۔ مَیں نے یہ واقعہ دورانِ گفتگو یہاں کے ایک مقبول فنکار کو سنایا تو اس نے بتایا کہ یہاں بھی فنکاروں سے ان کے

پرستاروں کی محبت کا یہی عالم ہے چنانچہ اس ضمن میں اس نے اپنا حوالہ دیا اور بتایا کہ ایک بار وہ اپنی سرخ کار باہر کھڑی کر کے شاپنگ کے لیے ایک دکان میں گیا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے پرستاروں نے اس کی سرخ کار کھرچ کھرچ کر سفید کر دی تھی۔ ممکن ہے یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا ہو، مگر یہ فنکار اس واقعہ سے جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتا تھا مَیں اس سے متفق نہیں ہوں کہ میرے خیال میں یہاں بھی لوگ فنکاروں کی پوری طرح قدر کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ واقعہ کسی نظریاتی گروہ کے غیظ و غضب کے نتیجے میں عمل میں آیا ہو کیونکہ یہاں کسی کے سرخ یا سبز ہونے کا اندازہ اس کی کار کے سرخ یا سبز ہونے سے لگایا جاتا ہے۔

قائد سے والہانہ محبت:

یہاں کے لوگ اپنے عظیم قائد مسٹر جناح سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اپنی اس عقیدت کے اظہار کے طور پر انہوں نے ایک روپے سے لے کر ہزار روپے کے کرنسی نوٹ پر قائد کی تصویر چھاپ رکھی ہے اور وہ قائد کی تصویروں والے ان کرنسی نوٹوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ چنانچہ مَیں نے انہیں اس کے حصول کے لیے پانی کی طرح ایک دوسرے کا خون بہاتے دیکھا ہے۔

آرٹ کے گراں قدر نمونے:

لاہور تہذیب و فن کا مرکز ہے، چنانچہ ملک بھر سے مختلف فنون کے ماہر یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ آرٹ کے جن نمونوں کو ہمارے ہاں قدر کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور جن کی تعریف میں ناقدین زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ لاہور میں اس آرٹ کے ماہرین ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور اس ضمن میں زیادہ عجیب پہلو یہ ہے کہ اس کے لیے یہ لوگ رنگ، برش یا کینوس استعمال نہیں کرتے بلکہ اس

کے لیے انہوں نے ایک انوکھا طریقہ دریافت کیا ہے، وہ درخت کا ایک پتہ منہ میں رکھتے ہیں اور پھر تھوڑی دیر بعد چلتے چلتے سڑک پر پچکاری سی مارتے ہیں جس سے چشم زدن میں خوبصورت بیل بوٹے بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے اس فن کے ساتھ اس قدر وابستگی اور اتنی شدید محبت ہے کہ انہیں خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے، چنانچہ بسا اوقات وہ موٹر سائیکل پر سوار یا چلتی کار کی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر پچکاری مار دیتے ہیں، جس سے کسی راہگیر کی سفید قمیض پر خوبصورت گل بوٹے بن جاتے ہیں۔ مَیں نے آرٹ کے یہ گراں قدر نمونے سڑکوں اور دیواروں کے علاوہ بلند و بالا عمارتوں کے زینوں اور ان کے کونے کھدروں میں خصوصاً بہت دیکھے!

شراب پر پابندی؟:

مَیں جن دنوں پاکستان میں تھا وہاں شراب پر پابندی تھی، البتہ میرے لیے یہ امر انتہائی حیرت انگیز تھا کہ اس پابندی سے بیئر نہ صرف یہ کہ مستثنیٰ تھی بلکہ یہ کھلے بندوں فروخت ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے بعض پادری بھی اسے پیتے تھے اور پھر سڑکوں پر لڑکھڑاتے پھرتے تھے۔ مَیں نے پہلی بار سخت گرمیوں کے موسم میں لاہور کے ایک مشہور علاقے بھاٹی گیٹ میں اس بیئر کا ایک گلاس پیا۔ یہ بیئر سفید رنگ کی ہوتی ہے، دہی سے تیار ہوتی ہے اور اسے گاہک کے سامنے کشید کیا جاتا ہے۔ دنیا کی یہ واحد بیئر ہے جس میں پانی حل ہو جاتا ہے تاہم مَیں نے اسے نشے میں ہر بیئر سے بہتر پایا۔ اس کا ایک گلاس پینے سے جسم ڈھیلا پڑنا شروع ہو جاتا ہے اور ایک عجیب طرح کی غنودگی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ لاہورئیے صبح شام یہ بیئر پیتے ہیں، چنانچہ صبح سے شام تک اونگھتے رہتے ہیں! اس بیئر کو مقامی زبان میں لسی کہا جاتا ہے۔

ایک روشن پہلو:

لاہور والوں کی زندگی کا ایک اور پہلو مجھے بہت روشن لگا اور وہ ان کا ایک دوسرے کے لیے زبردست گرم جوشی اور محبت کا جذبہ ہے۔ اپنے اس جذبہ کو برقرار اور مستحکم رکھنے کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مَیں نے متعدد بار دیکھا کہ کار میں بیٹھے ہوئے کسی شخص نے اپنے کسی دوست کو قریب سے اوورٹیک کرتے دیکھا تو اس نے ہارن بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر ان دونوں نے بے پناہ ٹریفک کے باوجود اپنی کاروں کو وہیں بریک لگائی اور دروازہ کھول کر سڑک کے بیچ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں مَیں نے بعض اوقات بہت ہولناک حادثے بھی ہوتے دیکھے۔ پیچھے آنے والے لوگوں کو بڑبڑاتے بھی دیکھا، مگر لاہوریے ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ افسوس ہم ان جذبوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں!

ایک انکشاف:

پاکستان میں قیام کے دوران مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا اور وہ یہ کہ نیوز ویک، ٹائم، گارڈین اور اس طرح کے بڑے بڑے ہفت روزوں اور روزناموں میں لکھنے والے مغربی صحافی پاکستان کے مختلف اخبارات میں بھی قلمی ناموں سے مضامین اور سیاسی تبصرے لکھتے ہیں۔ یہ راز مجھ پر اس وقت منکشف ہوا جب مَیں نے یہاں کے اردو اخبارات میں شائع ہونے والے سیاسی تبصرے اور بعض دیگر مضامین ایک مقامی دوست سے ترجمہ کروا کر سنے۔ اس پر مَیں انگشت بدنداں رہ گیا اور مَیں نے مضمون نگاروں کے نام پوچھے تو اس نے سب پاکستانی نام بتائے جو یقیناً ان مغربی صحافیوں کے قلمی نام ہوں گے، کیونکہ مَیں ہو بہو یہی مضامین ان کے اصلی ناموں کے

ساتھ مغربی پرچوں میں پڑھ چکا تھا۔ خدا جانے انہیں یہاں ان کا ترجمہ اپنے قلمی ناموں کے ساتھ چھپوانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ سرپرائزنگ، ویری سرپرائزنگ!

بین الاقوامی بھائی چارہ:

مجھے یہاں کے صحافیوں کے ایک محدود طبقے میں بلکہ بعض ادیبوں اور دانشوروں میں بھی جو ایک انتہائی خوش آئند چیز نظر آئی وہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامی بھائی چارے، امن، دوستی اور بقائے باہمی کے اصولوں پر بہت پختہ ایمان رکھتے ہیں اور صرف ایمان ہی نہیں رکھتے ان زریں اصولوں پر کاربند بھی ہوتے ہیں، چنانچہ مَیں نے انہیں مختلف سفارت خانوں میں آتے جاتے دیکھا اور سفارت کاروں سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار پائے۔ خیرسگالی کی یہ فضا یک طرفہ نہیں تھی بلکہ یہ سفارت کار ان کے گھروں میں آتے جاتے تھے اور ان کے لیے بوتلیں اور ان کے بچوں کے لیے چوسنیاں اور تحفے تحائف لاتے تھے۔ یہ فضا اتنی خوشگوار تھی کہ پاکستانی صحافی ادیب اور دانشور بھی جب چاہتے ان کے ہاں چلے جاتے اور سگریٹ یا شراب میں سے جس چیز کی طلب ہوتی بلا تکلف بیان کرتے اور کریٹوں کے حساب سے اپنے ساتھ بھی لاتے۔ پاکستانی صحافیوں اور ادیبوں کے اس مخصوص طبقے اور مختلف سفارت کاروں کے مابین خوشگوار تعلقات کا یہ عالم تھا کہ یہ سفارت کار بین الاقوامی بھائی چارے، امن، دوستی اور عوام سے تعلقات مستحکم کرنے والے منصوبوں میں ان کا ہاتھ بٹاتے اور دامے، درمے اور قدمے؟ سخنے بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ یہ عظیم لوگ ہیں ہیٹس آف ٹو دیم۔

کیش کی وصولی:

لاہور کے بینکوں میں کیش کی وصولی کے دو طریقے ہیں۔ ایک چیک دے کر

دوسرا کیشیر کو پستول دکھا کر! دوسرا طریقہ عوام میں زیادہ مقبول ہے کیونکہ یہاں کے بینکوں میں چیک دے کر رقم کیش کرانے میں خاصا وقت لگتا ہے۔

غربت کی ایک مثال:

پاکستان میں غربت اور افلاس بہت زیادہ ہے۔ اتنی سائنسی ترقی کے باوجود ہزاروں لوگ درختوں کی چھال کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ یہ میں کوئی سنی سنائی بات نہیں کر رہا بلکہ اس طرح کے بیسیوں مناظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ لاہور میں قیام کے دوران میں روزانہ ایک قریبی پارک میں صبح کی سیر کے لیے جایا کرتا تھا۔ وہاں میں نے بے شمار لوگوں کو دیکھا کہ وہ کسی درخت کی ایک شاخ کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر چبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک مقامی دوست سے میں نے اس کا ذکر کیا تو اس نے ملک میں پائی جانے والی غربت پر پردہ ڈالنے کے لیے کہا کہ یہ لوگ درخت کی شاخ نہیں کھا رہے بلکہ اس سے مسواک (ٹوتھ پیسٹ) کر رہے ہیں۔ یہ سن کر میں مصلحتاً خاموش ہو گیا ورنہ مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا کیونکہ میں نے صبح کی سیر کے دوران کئی لوگ ایسے بھی دیکھے تھے جو ہاتھ میں پکڑی ہوئی آدھی سے زیادہ شاخ کھا چکے تھے اور باقی بس تھوڑی سی رہ گئی تھی۔

ایک انڈو پاک مشاعرہ:

میں نے یہاں ایک انڈو پاک مشاعرے میں بھی شرکت کی جس میں پاکستان کے علاوہ بھارت کے بہت سے شعراء نے بھی اپنا کلام سنایا جس سے مجھے احساس ہوا کہ دونوں ملکوں میں ثقافتی تعاون روز افزوں ہے تاہم مشاعرے کے بعد جب میں نے اپنے اس دوست کے سامنے (جو مجھے یہاں لایا تھا) متذکرہ خیال کا اظہار کیا تو وہ بہت ہنسا اور اس نے کہا یہ جو تم مختلف شاعروں کے ناموں کے آخر میں امروہوی، مراد

آبادی، جالندھری، لکھنوی، دہلوی اور امرتسری وغیرہ کے الفاظ سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ یہ شعراء اس مشاعرے میں شرکت کے لیے انڈیا سے آئے ہیں تو معاملہ یوں نہیں ہے، دراصل ان شعراء نے جالندھری اور لکھنوی وغیرہ کے الفاظ یونہی شو، شا کے لیے اپنے ساتھ ٹانکے ہوئے ہیں، ورنہ یہ سب پاکستانی ہیں اور ۱۹۴۷ء میں بھارت سے مستقل ہجرت کر کے یہیں آباد ہو چکے ہیں۔

ناک چھدوانا، دانت نکلوانا:

لاہور اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں لڑکیاں اپنے کان اور ناک چھدواتی ہیں۔ لاہور کے ایک مشہور تجارتی مرکز بانو بازار میں سے گزرتے ہوئے میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا، ایک بہت خوبصورت لڑکی اپنا ناک چھدوا رہی تھی اور مارے درد کے آنسو اس کی آنکھ سے بہہ کر خاموشی سے اس کے رخساروں پر پھیلتے جا رہے تھے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر کوفت ہوئی مگر میرا گائیڈ اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میں نے اس بے موقع ہنسی کی وجہ پوچھی تو اس نے دکان میں آویزاں ایک تختی کی عبارت کا ترجمہ مجھے سنایا۔ اس تختی پر لکھا تھا ''یہاں ناک اور کان بغیر درد کے چھیدے جاتے ہیں''۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ یہاں ٹرینوں اور بسوں میں کئی لوگ انگشت شہادت (دائیں ہاتھ کی انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی) سے بغیر درد کے دانت بھی نکال لیتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ یہ منظر بھی دیکھا تھا مگر آخر میں دانت نکلوانے والے نے تنگ آ کر دانت نکالنے والے کے دانت نکال دیے تھے۔

ایک مہم جُو نوجوان:

یہ جس بانو بازار کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے یہ بازار بالکل نہیں بلکہ ایک تنگ سی گلی ہے، جس میں سے گزرنا محال ہو جاتا ہے اور اس میں عموماً خواتین ہی شاپنگ کے

لیے آتی ہیں جن میں سے بیشتر نے یہاں کی روایت کے مطابق چوٹیاں (بالوں کو بل دے کر باندھنا) کی ہوتی ہیں تاہم مَیں نے چند نوجوانوں کو بھی یہاں گھومتے دیکھا لیکن مَیں نے انہیں خریداری کرتے نہیں پایا۔ بس وہ عورتوں کے ہجوم میں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ غالباً مہم جو نوجوان ہیں اور یہاں چوٹیاں سرکرنے کے لیے آتے ہیں!

اولادِ نرینہ کے لیے منت:

یہاں کے لوگ اپنی مرادیں پوری کرنے کے لیے منت مانتے ہیں اور ان میں سے بعض منتیں بہت عجیب ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی کے ہاں اولادِ نرینہ نہ ہو تو وہ منت مانتا ہے کہ لڑکے کی پیدائش سے لے کر اس کے سات سال کی عمر میں پہنچنے تک وہ اپنے اس لاڈلے بیٹے کو مانگے تانگے کے کپڑے پہنائے گا، چنانچہ مراد برآنے پر یہ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں اور جوٹھے کپڑے پہناتے ہیں۔ ایک روز میرا گزر پرانے کپڑوں کی ایک بہت بڑی مارکیٹ لنڈا بازار سے ہوا تو مَیں نے یہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو دیکھا۔ یقیناً ان سب نے اولادِ نرینہ کے لیے منت مانی ہوگی جو پوری ہوگئی ہوگی چنانچہ اب وہ یہاں دھڑا دھڑ اپنے لاڈلے بچوں کے لیے جوٹھے کپڑے خریدنے میں مشغول تھے!

ہر بار خلا پیدا ہونا:

لاہور میں میری موجودگی کے دوران کئی مشہور شخصیتوں کا انتقال ہوا۔ مَیں نے اخباروں میں مختلف لوگوں کے بیان پڑھے جن میں ہر مرنے والے کے بارے میں کہا گیا تھا کہ مرحوم کے انتقال سے ایک خلا پیدا ہوگیا۔ دراصل یہ مشرقی لوگ الفاظ کے معاملے میں بہت فیاض واقع ہوئے ہیں ورنہ ان میں سے ایک آدھ مرحوم ضرور

ایسا بھی ہوگا جس کی موت سے کوئی خلا پر ہوگیا ہوگا۔ لیکن یہاں کسی مرحوم کے بارے میں ایسی بات کہنا معیوب سمجھا جاتا ہے!

ایک مقبول رواج:

یہاں شاعری کا ایک انتخاب میری نظر سے گزرا جس میں مختلف شاعروں کے علاوہ ان کے حالاتِ زندگی اور ان کی تصویریں بھی شائع کی گئی تھیں۔ حالاتِ زندگی میں ایک شاعر کا سن پیدائش ۱۹۲۳ء درج تھا اور اس کے ساتھ اس کی جو تصویر شائع کی گئی تھی وہ بھی غالباً ۱۹۲۳ء ہی کی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں شعراء کے ہاں اپنی نوعمری کی تصویریں شائع کرانے کا خاصا رواج ہے!

اشتعال انگیز نعرے:

مَیں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بازار میں چیختے چلاتے گزر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کچھ اور لوگ بھی اس سڑک پر سے گزرے، ان کے چہرے تنے ہوئے تھے اور وہ بھی بہت بری طرح چیخ رہے تھے۔ مَیں نے ایک راہ گیر سے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ ہے اور یہ لوگ چیخ چیخ کر کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ یہ لوگ "ہم تمہارے گھروں کو آگ لگا دیں گے، تمہارے بچوں کو قتل کر کے ان کی انتڑیاں ہوا میں اچھالیں گے، تمہاری لاشوں پر بھنگڑے ڈالیں گے اور تمہاری لڑکیاں نکال کر لے جائیں گے" کے کلمات ادا کر رہے ہیں۔ مَیں یہ سن کر بہت حیران ہوا کیونکہ بازار میں موجود لوگوں میں سے کسی کے چہرے پر اتنے اشتعال انگیز نعروں کے باوجود کوئی تشویش نہیں تھی اور نہ ہی اردگرد کے دکانداروں میں کسی قسم کا خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ اس پر متذکرہ راہگیر نے وضاحت کی اور مجھے بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ دراصل قریبی سینما میں ایک فلم کا شو ٹوٹا ہے اور یہ لوگ اس فلم میں سے

اپنے پسندیدہ ڈائیلاگ اس فلم کے ہیرو کی ''نون'' میں دہراتے ہوئے گزر رہے ہیں!

اسیں مر گئے آں؟:

قیام لاہور کے دوران میری ملاقات عاشقوں کے ایک گروہ سے بھی ہوئی۔ انہوں نے یہ ملاقات کسی وفد کی صورت میں نہیں کی بلکہ مجھے ان سے انفرادی ملاقاتوں کا موقع ملا اور مَیں نے ان میں سے ہر ایک کو اپنی جگہ منفرد خصوصیات کا مالک پایا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بنیادی حقوق سے محروم ہیں اور خاصی کسمپرسی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ محبوبہ کے اہلِ خاندان اور ان سے بھی زیادہ اہلِ محلّہ ہیں۔ اہلِ محلّہ اپنے محلے میں کسی دوسرے محلے کے عاشق کے داخلے کو پسند نہیں کرتے، اس سلسلے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ ''اسیں مر گئے آں؟'' مَیں نے کئی لوگوں سے اس جملے کی رمزیت دریافت کی مگر تمام تر تشریح کے باوجود مَیں پوری طرح اس جملے کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ یقیناً اس کا کوئی کلچرل پس منظر ہوگا!

ڈبل ڈیوٹی:

یہاں مَیں نے لڑکیوں کے بھائیوں کو بہت شکی پایا، وہ اپنی کڑی نگرانی میں انہیں کالج تک چھوڑنے جاتے ہیں اور پھر کالج سے واپس لے کر آتے ہیں تاہم وہ یہ کام جلدی سے جلدی نپٹانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس کے بعد انہوں نے خود کسی بس سٹاپ پر کھڑے ہو کر کسی اور کو کالج تک چھوڑنا اور پھر اسے واپس گھر تک پہنچا کر آنا ہوتا ہے۔ یہ ڈبل ڈیوٹی ان کے لیے خاصی اعصاب شکن ہوتی ہوگی۔

کزن:

یہاں ''کزن'' کا رشتہ مجھے خاصا الجھا ہوا محسوس ہوا، ایک شخص نے اپنی ساتھی

خاتون کا تعارف مجھ سے کرایا اور کہا: ''یہ میری کزن ہے''۔ اس وقت میرے پاس ایک اور شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میرے کان میں کہا: ''پچھلے سال یہ میری کزن تھی!'' رشتے کی یہ ''روٹیشن'' مَیں نے اس خطے میں دیکھی ہے۔ مشرق واقعی بہت پراسرار ہے۔

علمی فضا:

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے علیحدہ علیحدہ کالج ہیں جبکہ یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم رائج ہے۔ مخلوط تعلیمی اداروں میں لڑکے لڑکیاں کلاس روم میں استادوں کے لکھائے ہوئے نوٹس ایک دوسرے سے طلب کرتے ہیں اور پھر نوٹس کے تبادلے کی صورت میں وہ اکثر کسی گوشۂ تنہائی میں پوری محویت کے ساتھ ان پر تبادلہ خیال کرتے نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہاں کے اہلِ دانش یونیورسٹیوں میں علمی فضا کے فقدان کا رونا روتے رہتے ہیں تاہم ایک اہلِ دانش نے میرے متذکرہ خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا: ''آپ بھولے بادشاہ ہیں''۔ خدا جانے یہ ''بھولا بادشاہ'' کیا ہوتا ہے۔

میٹنگ پوائنٹ:

اندرون شہر کے عشاق اپنی محبوبہ سے عموماً اپنے یا اسکے گھر کی سیڑھیوں میں ملاقات کرتے ہیں یا میٹنگ پوائنٹ طے کرنے کے لیے اپنے مکان کی چھتوں پر کھڑے ہو کر کسی ڈھیلے میں رقعہ لپیٹ کر ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں جس کے نتیجے میں اکثر رقعہ گلی میں جا گرتا ہے اور ڈھیلا کسی بزرگ کو جا لگتا ہے۔ سیانوں سے سنا ہے اس میں اکثر و بیشتر خاصی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

رانگ نمبر:

ملاپ کی ایک صورت ٹیلیفون پر رانگ نمبر ملنے کی صورت میں بھی ہوتی ہے جس

کے نتیجہ میں بسا اوقات نوبت شادیوں تک بھی پہنچ جاتی ہے مگر مجھے بتایا گیا کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد طرفین محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے رانگ نمبر ہی پر گفتگو کرتے چلے آرہے ہیں!

بول بچن:

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ جب یہاں کوئی کسی سے کہتا ہے کہ "مجھے تم سے محبت ہے" تو اس کا مطلب ضروری نہیں کہ واقعی یہی ہو بلکہ یہ فقرہ یہاں عموماً رومانی فضا پیدا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے جب کہ ہم لوگوں کی ضرورت سے زیادہ حقیقت پسندی نے ہماری زندگیوں سے رومانس کی چاشنی ختم کر دی ہے۔ یہاں کے لوگ اس قسم کی رومانی گفتگو کو بول بچن کہتے ہیں جس کا صحیح مفہوم مجھ پر پوری طرح واضح نہیں ہو سکا۔

ایک میان میں ایک تلوار:

یہاں میں نے ایک عجیب رواج دیکھا کہ لوگ جس سے محبت کرتے ہیں، اس سے عموماً شادی نہیں کرتے اور جس سے شادی کرتے ہیں اس سے محبت نہیں کرتے۔ شاید یہ لوگ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک چیز ہو سکتی ہے، چنانچہ وہ شادی اور محبت میں سے ایک کا انتخاب کرتے ہیں۔

فرسٹ کم، فرسٹ سروڈ:

قیام لاہور کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ عشق کرنے کے لیے یہاں کے لوگ کسی انتخاب کے چکر میں نہیں پڑتے بلکہ زندگی میں پہلی بار جس سے ملاقات کا موقع میسر آ جائے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ یہاں کی معاشرتی

زندگی میں ایسے مواقع روز روز نہیں آتے۔ اس "فرسٹ کم فرسٹ سروڈ" کے اصول کو یہاں "فرسٹ سائٹ لو" کہا جاتا ہے!

ذاتی مسئلہ:

میں نے یہاں کئی لوگوں کو متعدد مواقع پر یہ فقرہ بولتے سنا کہ "مومن ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا"۔ جب کہ میں نے بیک وقت متعدد مومنوں کو ایک ہی سوراخ سے ڈسے جاتے بھی دیکھا ہے۔ بہر حال یہ ان لوگوں کا ذاتی مسئلہ ہے یا پھر اجتماعی مسئلہ ہے!

صاحب اور صاحب اختیار:

لاہور میں قیام کے دوران مجھے ایک روز کے لیے اپنے سفارت خانے جانا پڑا، مگر اسلام آباد جانے کے لیے مجھے پی آئی اے کا ٹکٹ دستیاب نہ ہو سکا کہ جس فلائٹ میں میں جانا چاہتا تھا، پی آئی اے کے عملے کے مطابق اس میں جگہ نہیں تھی۔ میرا ایک شناسا مجھے پی آئی اے کے ایک بہت بڑے افسر کے پاس لے گیا جو اس کا دوست تھا اور اسے میری ایمرجنسی سے آگاہ کیا۔ وہ ایک خوش خلق انسان تھا۔ اس نے ہمیں کافی پلائی اور اس دوران ٹیلی فون پر ماتحت عملے سے فلائٹ کی صورت حال دریافت کی اور کہا جس طرح بھی ہو ایک سیٹ کا بندوبست کیا جائے، مگر اسے بتایا گیا کہ اس فلائٹ میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، چنانچہ اس نے مجھ سے معذرت کی اور کہا کہ اگر تھوڑی بہت گنجائش بھی ہوتی تو آپ کے لیے سیٹ کا بندوبست یقیناً ہو جاتا۔ اس گفتگو کے دوران صاحب کا چپڑاسی کافی کے برتن سمیٹ رہا تھا جب اس نے اپنے باس کے چہرے پر مایوسی کے آثار دیکھے تو وہ اس کے پاس جا کر مؤدب کھڑا ہو گیا اور کہا: "سر!

اگر اجازت ہو تو میں کچھ کوشش کروں؟'' اس پر اس کے باس نے ہنس کر کہا: ''میاں، میں پوری کوشش کر چکا ہوں مگر تم بھی کر دیکھو!'' تھوڑی دیر بعد جب چپڑاسی واپس آیا تو ٹکٹ اس کے ہاتھ میں تھا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ خاصا اثر ورسوخ والا شخص ہے!

مجھے میرے دوست نے بتایا کہ یہاں بعض افسروں سے زیادہ ان کے چپڑاسی بااختیار ہوتے ہیں۔

قومی ہیرو:

لاہور ایئرپورٹ اس عظیم تاریخی شہر کے شایان شان نہیں ہے۔ میں جب وہاں پہنچا تو چھوٹے سے لاؤنج میں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میں نے یہاں ایک مسافر دیکھا کہ وہ ہاروں سے لدا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا، اس کے ساتھ سوڈیڑھ سو کے قریب عورتیں، مرد اور بچے تھے، کوئی خاصا امیر آدمی تھا، غالباً پورا جہاز چارٹر کرا کر لے جا رہا تھا مگر میرے دوست نے مجھے بتا کر جلد ہی میری غلط فہمی دور کر دی کہ مسافر تو صرف یہ ہے، باقی لوگ تو اسے الوداع کہنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی قومی ہیرو ہے جسے پورے اعزاز کے ساتھ کسی بڑی مہم کے لیے رخصت کیا جا رہا ہے، مگر میرے دوست نے ایک بار پھر مجھے بتایا کہ ایسی بات نہیں ہے اس شخص نے ملازمت کے لیے بیرون ملک جانا ہے اور اس وقت اسلام آباد ویزا لگوانے کے لیے جا رہا ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔

میڈیکل چیک اپ:

یہاں جہاز میں سوار ہونے سے پہلے ہر مسافر کا میڈیکل چیک اپ کیا جاتا ہے کہ آیا وہ سفر کے قابل ہے بھی یا نہیں! چنانچہ دوسرے مسافروں کی طرح مجھے بھی ایک کیبن میں لے جا کر میرے بازو، ٹانگیں اور سینہ وغیرہ ٹٹول ٹٹول کر دیکھے گئے تاہم میں

پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ میڈیکل چیک اپ تھا یا مسافروں کی تلاشی لی جا رہی تھی، غالباً یہ میڈیکل چیک اپ ہی تھا، کیونکہ تلاشی تو اس طرح نہیں لی جاتی!

قربانی:

فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہونے پر میں اپنا بیگ اٹھا کر دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز کی طرف جا رہا تھا کہ ڈیوٹی پر موجود پی آئی اے کے ایک افسر نے مجھے روک کر بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور دوسرے ہی لمحے میں نے بھی اسے پہچان لیا مجھ سے اس کی ملاقات چند برس قبل میرے ملک میں ہوئی تھی اور اس سے روابط بڑھ جانے پر حتی المقدور اس کی مہمانداری کی تھی، وہ مجھ سے بڑی دیر تک میرے ملک کے لوگوں کی تعریف کرتا رہا کہ بڑے فرض شناس لوگ ہیں کام کے وقت کام اور آرام کے وقت آرام کرتے ہیں۔ دریں اثنا جہاز کی روانگی کا وقت ہو چلا تھا صرف میری وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی مگر میرا دوست مجھے اتنی جلدی رخصت کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ بضد تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے پی جائے۔ مجھے متامل دیکھ کر اس نے مجھے بتایا کہ جہاز کی طرف سے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کے بغیر یہ پرواز نہیں کرے گا کیونکہ اس نے عملے کو کہہ دیا ہے۔ مجھے اور جہاز کے دیگر مسافروں کو اس کی یہ مہمان نوازی ہمیشہ یاد رہے گی کیونکہ جہاز مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ تاخیر سے روانہ ہوا، ہم مادہ پرست مغربی لوگ اپنے مہمانوں کے لیے اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتے!

ایئرہوسٹس:

میں جب پاکستان میں آیا تھا اس وقت مجھے بتایا گیا تھا کہ یہاں سوشلزم نافذ کیا جا رہا ہے۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ اب یہاں اسلام کے نفاذ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

ایئر ہوسٹس کی شباہت دیکھ کر مجھے یقین ہوا کہ یہاں واقعی نفاذِ اسلام کی کوششیں جاری ہیں کیونکہ اسے دیکھ کر دل میں کسی قسم کے فاسد خیالات کا پیدا ہونا ممکن نہیں تھا البتہ سٹورٹ خاصا دلکش نوجوان تھا۔ مجھے پالیسی کا یہ دورخا پن سمجھ نہ آیا کیونکہ آخر خواتین بھی تو جہاز میں سفر کرتی ہیں!

احساسِ کمتری:

مَیں نے سفر کے دوران محسوس کیا کہ جہاز کے مسافر میزبان عملے سے زیادہ خوش نہیں ہیں کیونکہ میرے پاس بیٹھا ہوا مسافر مسلسل گرمبلا کر رہا تھا کہ مسافروں کی مناسب دیکھ بھال نہیں ہوتی تاہم مجھے یہ شخص قنوطی لگا کیونکہ میزبان عملے کا رویہ میرے ساتھ نہایت خوشگوار تھا اور اس وقت تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص قنوطی ہے جب اس نے میری بات کے جواب میں کہا کہ تمہارے ساتھ ان کا سلوک اس لیے اچھا ہے کہ تم گوری چمڑی والے ہو اگر تم بھی ''دیسی'' ہوتے تو تمہیں ان کی میزبانی کا صحیح اندازہ ہوتا۔ مجھے اس مسافر کی اس بات سے احساسِ کمتری کی بو آئی۔

ایک دلچسپ واقعہ:

ابھی جس مسافر کا مَیں نے ذکر کیا ہے اس کا نام مسٹر ملک تھا۔ یہ محکمہ زراعت کا کوئی افسر تھا۔ یہ اپنے باس سے بہت نالاں تھا اور اس کی نالائقی کی داستانیں اسے ازبر تھیں۔ اپنے اس باس کے بارے میں اس کے جذبات اس قدر شدید تھے کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ اسے موٹی موٹی گالیاں دینے لگتا تھا اور اس دوران اس کی آواز خاصی اونچی ہو جاتی تھی۔ دریں اثنا ہم سے اگلی نشست پر بیٹھا ہوا ایک مسافر اپنی جگہ سے اٹھا اور مسٹر ملک کے پاس آ کر اس سے ہاتھ ملایا اس کی خیریت دریافت کی اور پھر باتھ روم کی طرف چلا گیا، اسے دیکھ کر مسٹر ملک کا رنگ فق ہو گیا اور زبان گنگ ہو گئی،

کیونکہ جس شخص نے آ کر اس سے ہاتھ ملایا تھا، یہ اس کا وہی باس تھا جسے وہ گزشتہ آدھ گھنٹے سے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ مَیں اس صورت حال سے بہت محظوظ ہوا۔

لوکل جوک:

جس روٹ پر مَیں سفر کر رہا تھا اس روٹ پر عموماً فوکر کی فلائٹ ہوتی ہے۔ طیارہ ساز کمپنیوں نے ایک عرصے سے یہ طیارہ تیار کرنا بند کر دیا ہے، چنانچہ ان کی حیثیت اب ''اینٹیق'' کی سی ہے۔ فضائی میزبانوں نے جب مہمانوں کو چائے سرو کرنے کے لیے ٹرے گرانا شروع کیں تو ایئر پاکٹس شروع ہو گئیں جس کی وجہ سے جہاز ہچکولے کھانے لگا چنانچہ ایک اعلان کے ذریعے معذرت کی گئی کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے مہمانوں کو چائے سرو نہیں کی جا سکے گی، مگر میرے قنوطی ہم سفر نے ایک بار پھر زبان کھولی اور کہا ''یہ جہاز ہمیشہ عین اس وقت ہچکولے کھانے لگتا ہے جب چائے پیش کرنے کا وقت ہو!'' انہی ہچکولوں کے درمیان مَیں نے اپنی اور اس کی توجہ ہٹانے کے لیے اس سے ایسے ہی پوچھا کہ ''جہاز کتنے بجے اسلام آباد پہنچ جائے گا؟'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا ''اگر پہا ٹک کھلا ہوا تو ہم اور پندرہ منٹ تک اسلام آباد پہنچ جائیں گے'' اور اس کے ساتھ ہی وہ ہنسنے لگا۔ مجھے اس مذاق کی سمجھ نہیں آئی۔ کوئی لوکل جوک (LOCAL JOKE) ہو گا۔

خوشگوار سفر:

دریں اثنا ہم اسلام آباد کی فضائی حدود میں داخل ہو گئے تھے، انہی ہچکولوں کے درمیان اعلان کیا گیا ''ہم تھوڑی دیر بعد اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔ امید ہے ہمارے ساتھ آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہو گا۔ اس پر میرے ہم سفر نے ایک بار پھر مجھے مخاطب کیا اور کہا ''یہ روٹین کا اعلان ہے، اس کا برا نہ ماننا!''

سپورٹس مین سپرٹ:

مَیں چند روز کے لیے جس گھر میں قیام پذیر تھا اس کے بالکل سامنے ایک مسجد تھی جس کے ایک مینار پر چار لاؤڈ سپیکر فٹ تھے۔ ایک روز رات کو یہاں کوئی جلسہ ہو رہا تھا، چنانچہ مقررین کی گونج دار آوازوں سے سارا علاقہ لرز رہا تھا۔ مَیں نے سونے کی کوشش کی اور جب نیند نہ آئی تو یہ جلسہ دیکھنے کے لیے مسجد میں داخل ہو گیا تا کہ اپنے سفرنامے میں اس پہلو کا احاطہ بھی کرسکوں۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک مقرر نہایت پرجوش انداز میں تقریر کر رہے تھے اور ان کے اردگرد پانچ چھ لوگ بیٹھے سر دھن رہے تھے۔ مَیں نے ان سامعین میں سے ایک سے پوچھا کہ یہ مقرر کون صاحب ہیں اور آپ کون لوگ ہیں۔ اس نے کہا: ''خوش نصیب مقرر کا نام علامہ ہے جو ایک گھنٹے سے تقریر کر رہا ہے اور ہم وہ ہیں جنہوں نے ابھی تقریر کرنی ہے۔ بس اب باری آیا ہی چاہتی ہے۔ آپ تشریف رکھیں''۔

زندہ دل لوگ:

مَیں ایک روز بازار میں سے گزر رہا تھا کہ مَیں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ لوگوں نے ایک شخص کا منہ کالا کر کے اسے گدھے پر سوار کر رکھا تھا اور شہر کے بچے اس کے پیچھے پیچھے شور مچاتے جا رہے تھے۔ گدھے پر سوار شخص خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ مَیں نے فوراً اپنا کیمرہ درست کیا اور تصویر کھینچنے کے لیے جھکا۔ اس دوران مَیں نے دیکھا کہ گدھے پر سوار شخص کے چہرے پر پریشانی غائب ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنا پوز درست کرنے کے لیے ایک دم اپنی گردن ذرا ترچھی کی اور مسکرانے لگا۔ مَیں نے فوراً تصویر اتاری اور وہاں سے جانے ہی کو تھا کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے کہا: ''گدھے پر سوار شخص نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور فرمائش

کی ہے کہ اس تصویر کی ایک کاپی اسے بھی ضرور دیں''۔ مَیں نے اس سے پتہ حاصل کیا اور پھر پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ تو اس نے بتایا کہ چند روز پیشتر ایک لڑکی اغوا کر کے لے گیا تھا۔ آج یہ محلے والوں کے قابو آیا ہے۔ انہوں نے اسے سزا دینے کے لیے منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا دیا ہے اور اب اسے تھانے لے جا رہے ہیں۔

سراسر ناانصافی:

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اگلے ہی روز مَیں نے پھر یہی منظر دیکھا۔ اس بار ایک شخص گھوڑے پر سوار تھا، تاہم اس نے اپنا منہ ریشمی تاروں سے ڈھانپا ہوا تھا اور بہت سے بچے شور مچاتے ہوئے اس کے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان بچوں کے ساتھ مختلف عمروں کے لوگ بھی تھے۔ علاوہ ازیں گھوڑے کے آگے آگے ایک شخص ڈھول بجا رہا تھا اور کچھ دوسرے لوگ مختلف ساز بجا رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے ایک بہت بڑے باجے کو بکل ماری ہوئی تھی اور اس میں سے انتہائی خوفناک آواز نکالتا تھا۔ غالباً یہ اوزار گھوڑے پر سوار شخص کو خصوصی اذیت دینے کے لیے تھا۔ مَیں نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص معاشرے میں قدرے برتر مقام کا حامل ہوگا۔ تبھی اسے گدھے کے بجائے گھوڑے پر سوار کیا گیا ہے، نیز اسے یہ سہولت دی گئی ہے کہ وہ اپنا منہ ریشمی تاروں سے ڈھانپ لے، مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ ایک جیسے جرم پر دو طرح کی سزائیں دینا عدل کے اصولوں کے منافی ہے اور یوں میرے نزدیک یہ فعل سراسر ناانصافی کے زمرے میں آتا ہے۔ اہلِ پاکستان کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔

معذور افراد:

لاہور میں مجھے ایک خاصی تعداد معذور لوگوں کی نظر آئی جس پر مجھے بہت دکھ ہوا۔ لگتا ہے حفظانِ صحت کا محکمہ اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دے رہا۔ صورتحال

کی سنگینی کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اس کا اثر پھلوں پر بھی ہونے لگا ہے! چنانچہ مَیں نے یہاں ایک آم دیکھا جس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ یہ لنگڑا آم ہے۔ مَیں نے تجربے کے طور پر اسے کھا کر دیکھا تو بے حد لذیذ پایا۔ مَیں نے سوچا ابھی یہ آم لنگڑا ہے اور یہ عالم ہے۔ اگر یہ لنگڑا نہ ہوتا تو خدا جانے کس قدر لذیذ ہوتا؟

اہلِ فن کی بے قدری:

لاہور کی سڑکوں پر قسمت کا حال بتانے والے، بندر نچانے والے اور جادو کے کمالات دکھانے والے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ مَیں یہاں کے ایک مشہور بازار بیڈن روڈ سے گزر رہا تھا کہ مَیں نے ایک ریڑھی کے گرد چند لوگ کھڑے دیکھے، وہاں ایک جادوگر کھلی فضا میں اپنے کمالات دکھا رہا تھا اور اس نے لمبے بازوؤں والا چوغا بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ مَیں نے گزرتے گزرتے دیکھا کہ اس جادوگر نے مٹی کے ایک برتن کو تین چار مرتبہ ہلایا اور پھر اس پر سے ہاتھ اٹھایا تو ایک موسمی پھل جو غالباً جامن تھا، کثیر مقدار میں اس مٹی کے برتن میں سے برآمد ہوا جو اس نے وہاں کھڑے لوگوں میں بانٹ دیا۔ یہ جادوگر بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ مَیں نے سوچا اگر یہ باکمال شخص یورپ میں ہوتا تو یقیناً لاکھوں میں کھیلتا۔

بے مثال خطیب:

اہلِ فن کی ناقدری کی صرف یہی ایک مثال نہیں، بلکہ مَیں نے لاہور کے قیام کے دوران ایسے بہت سے واقعات کا مشاہدہ کیا۔ مثلاً مَیں ایک روز گھر سے نکلا تو باہر سڑک پر ایک بے مثال خطیب ایک بڑے مجمع کو خطاب کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو میں اتنا سحر تھا کہ لوگ بت بنے کھڑے تھے۔ مَیں اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر تقریباً پانچ گھنٹے کے بعد واپس اسی جگہ آیا۔ یہ خطیب اسی طرح شعلہ فشانی میں مشغول تھا اور لوگ

اسی محویت کے عالم میں اس کی تقریر سن رہے تھے مجھے ایک شخص نے بتایا کہ یہ خطیب مقوی ادویات بیچ کر اپنا گزارا کرتا ہے۔ یہ صورت حال یقیناً افسوسناک ہے۔

مونچھیں:

پاکستان میں مونچھیں رکھنے کا رواج عام ہے۔ بیشتر نوجوانوں کے چہروں پر مونچھیں سجی ہوتی ہیں جو انہیں اچھی لگتی ہیں، ان کی دیکھا دیکھی تو کئی لڑکیاں بھی مونچھیں رکھنے لگی ہیں۔ اس وبا یا رجحان کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔

زندہ دلانِ لاہور:

لاہور میں فوٹو سٹیٹ اور وزن ظاہر کرنے والی مشینیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ مجھے کسی دستاویز کی فوٹو سٹیٹ کرانے کی ضرورت تو محسوس نہ ہوئی، البتہ انارکلی میں سے گزرتے ہوئے ایک روز مَیں وزن کرانے کے لیے یونہی ایک جگہ رک گیا۔ وزن کیا تو ایک سو تیس پونڈ نکلا۔ اس پر مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے ایک اور شخص کی مشین سے وزن کیا تو اب کے ڈھائی سو پونڈ تھا۔ جس پر میرا دل دھک سے رہ گیا، مگر پھر ایک اور مشین والے نے وزن کی سوئی اوپر نیچے ہوتی دیکھی تو مجھے تسلی دی اور کہا: ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دراصل زندہ دلانِ لاہور بہت جذباتی واقع ہوئے ہیں، چنانچہ ان کا وزن ذرا سی بات پر بڑھ جاتا ہے، ذرا سی بات پر گھٹ جاتا ہے۔ یہ اس شہر کا خاصا ہے۔ آپ اپنے سفارت خانے سے اپنا وزن کرائیں۔ یہ مشینیں تو مقامی لوگوں کے لیے ہیں''۔

عبادت گزار پاکستانی:

مَیں نے لاہور میں دیکھا کہ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوتی تھیں، میں اپنے

شوقِ تجسس کے لیے مسلمانوں کو نماز پڑھتے خود دیکھنا چاہتا تھا تا کہ مجھے پتہ چلے کہ ان کی عبادت کا طریقہ کیا ہے، چنانچہ ایک مقامی دوست مجھے ایک مسجد میں لے گیا، یہاں لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے، پھر یہ گھٹنوں کے بل جھک جاتے تھے، دوست نے بتایا اسے رکوع کہتے ہیں اور پھر وہ اپنا ماتھا زمین پر لگاتے تھے، اسے سجدہ کہا جاتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ پاکستانی مسلمان مسجدوں کے علاوہ بھی، جب اور جہاں وقت ملے، عبادت کرتے ہیں، حتیٰ کہ ویگنوں میں سفر کے دوران بھی یہ رکوع کی حالت میں ہوتے ہیں، میں نے دفتروں میں بھی دیکھا کہ کوئی بڑے سے بڑا حسر بھی اپنے چھوٹے سے چھوٹے ملازم کو اپنے دفتر میں بلائے تو یہ وہاں بھی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ کئی لوگ تو اتنے عبادت گزار ہیں کہ وہ حاکمِ وقت کے دبدبے کی پرواہ کیے بغیر اس کی موجودگی میں سجدہ میں گر جاتے ہیں۔۔۔۔ بڑی بات ہے!

مارشل ریس:

میرا مقامی دوست جب مجھے لاہور کی مسجدیں دکھانے کے لیے لے گیا تو میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ ہر مسجد کے چاروں طرف مسلح افراد چوکس کھڑے تھے۔ میں پاکستانی مسلمانوں کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوا کہ وہ اتنے شدید پہرے کی پرواہ کیے بغیر مسجد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے تھے اور اپنے خدا کی عبادت کرتے تھے تاہم مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ مسلمانوں کے ملک میں عبادت پر پابندی کیوں ہے؟ کہ اللہ جانے کدھر سے حملہ ہو جائے۔ میرے دوست نے میری یہ غلط فہمی دور کی، اس نے مجھے بتایا کہ عبادت پر کوئی پابندی نہیں، دراصل ہم مسلمان مارشل ریس ہیں چنانچہ ہم میں سے بیشتر لوگ ہر وقت مسلح رہتے ہیں، اس سے نہ

صرف یہ کہ میری غلط فہمی دور ہو گئی بلکہ مارشل ریس کے حوالے سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ پاکستان میں بار بار مارشل لاء کیوں لگتا ہے۔

مجبوری:

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ مسلمان علما حجروں میں رہتے ہیں، روکھی سوکھی کھاتے ہیں اور دین کی خدمت کرتے ہیں، مگر میں نے یہاں علما کو شاندار کوٹھیوں میں رہتے اور پجیرو اور لینڈ کروزرز میں مسلح محافظوں کے غول کے ساتھ سفر کرتے دیکھا تو حیران ہوا۔ مگر میرے دوست نے مجھے بتایا کہ علما آج بھی حجروں میں ہی رہتے ہیں اور روکھی سوکھی کھا کر دین کی خدمت کرتے ہیں۔ تم نے جن لوگوں کو شاندار زندگی گزارتے دیکھا، وہ بھی علما ہی ہیں لیکن ان کا تعلق منبر و محراب سے نہیں، سیاسی جماعتوں سے ہے۔ سیاست میں دنیاداروں کا مقابلہ دنیاداری ہی سے کرنا ان علما کی مجبوری ہے، ورنہ انہیں یہ کروفر خود بھی پسند نہیں ہے۔

جدید ایجادات:

میں اپنے اس دوست کے جواب سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہوا مگر میں نے بحث نہیں کی، البتہ پوچھا کہ یہ لوگ اپنے ساتھ گن مین کیوں لیے پھرتے ہیں کیونکہ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ تمہارے تین خلفاء ایک ایک کر کے شہید ہو گئے مگر انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے کوئی پہریدار مقرر نہیں کیا؟ دوست نے جواب دیا کہ اس زمانے میں گن ایجاد نہیں ہوئی تھی چنانچہ گن مین کا بھی کوئی تصور نہیں تھا اور اسلام جدید ایجادات کے استفادہ سے منع نہیں کرتا۔۔۔۔ یقیناً اس کی وجہ کوئی اور ہو گی جو میرا دوست مجھ سے چھپانا چاہتا تھا!

انشاءاللہ:

مَیں نے پاکستان میں قیام کے دوران پاکستانیوں کو تین چار لفظ بہت زیادہ استعمال کرتے دیکھا، یہ الفاظ انشاءاللہ، ماشاءاللہ اور الحمد للہ وغیرہ تھے...... اور یہ لفظ عجیب عجیب جگہ استعمال ہوتے تھے، مثلاً الحمد للہ بچہ اسکول سے بخیریت واپس آ گیا ہے، جو دوا بازار سے خریدی تھی ماشاءاللہ، وہ تو اصلی نکلی، انشاءاللہ کل میں آپ کی طرف آؤں گا...... مَیں نے ایک دوست سے انشاءاللہ کا مطلب پوچھا، اس نے بتایا کہ اسکا مطلب ''اگر اللہ نے چاہا'' ہے، تب مجھے پتہ چلا کہ جب بھی کوئی پاکستانی دوست انشاءاللہ کہہ کر مجھ سے کوئی وعدہ کرتا تھا، وہ پورا کیوں نہیں ہوتا تھا، یقیناً اللہ نے نہیں چاہا ہوگا۔

سووینیئر:

پاکستان میں مجھے گداگر بہت زیادہ نظر آئے یہ بات مجھے ان کے موجد بیک ہوم میں میرے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے دوستوں نے بھی بتائی تھی چنانچہ مَیں پاکستان میں جہاں جاتا تھا، وہاں گداگروں کا ہجوم ہو جاتا تھا، مگر میرے پاکستانی دوست نے مجھے اس ضمن میں کوئی اور ہی بات بتائی اس کا کہنا تھا کہ یہ گداگر نہیں، بلکہ مختلف ملکوں کے سکے جمع کرنے کے شوقین لوگ ہیں جنہیں یہ بطور سووینیئر اپنے پاس رکھتے ہیں چونکہ تم غیر ملکی ہو، اس لیے یہ تمہارے گرد جمع ہو جاتے ہیں...... مَیں سمجھا شاید یہ دوست ٹھیک کہتا ہے!

گداگر؟:

ایک دن مَیں نے آزمانے کے لیے اپنے گرد جمع مختلف ملکوں کے سکے اکٹھے

کرنے کے شوقین لوگوں میں ایک ایک ڈالر تقسیم کیا جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے جیسے پندرہ بیس مزید لوگوں کو لے کر آ گئے جنہوں نے مجھ پر دھاوا بول دیا، میرا دوست وہاں سے کار بھگا کر لے گیا۔ وہ کچھ شرمندہ سا لگتا تھا مگر وہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ جن لوگوں میں، مَیں نے پیسے تقسیم کیے وہ گداگر تھے، اس نے اس کی ایک عجیب وغریب توجیہ پیش کی، جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ یہ اچھے خاصے بینک بیلنس والے لوگ ہیں، انہوں نے محض آزمانے کے لیے فقیروں کا روپ دھارا ہوا ہے، اس نے اس حوالے سے مجھے ایک شعر سنایا اور اس کا ترجمہ بھی کر کے دیا، میری ڈائری میں وہ شعر لکھا ہوا ہے، وہ شعر کچھ یوں ہے:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مَیں اپنے دوست کی وضاحت سے قطعاً مطمئن نہیں ہوا بلکہ مجھے یقین ہو گیا کہ جس شاعر کا یہ شعر ہے، وہ خود بھی کوئی گداگر ہے!

ایک معصوم سا بچہ:

لاہور میں ایک دورویہ سڑک ہے جس کے دونوں طرف باغات ہیں اور درمیان میں نہر بہتی ہے، یہ دنیا کی خوبصورت ترین سڑکوں میں سے ایک ہے، ایک روز مَیں کار پر جا رہا تھا کہ مَیں نے دیکھا کہ سڑک کے عین درمیان میں ایک معصوم بچہ ہچکیاں لے لے کے رو رہا ہے، اس کے قریب ایک تھرماس ٹوٹی پڑی ہے جس میں سے آئس کریم (جسے مقامی لوگ قلفی کہتے ہیں) بہہ کر سڑک پر پھیل گئی ہے۔ مجھے اس معصوم بچے نے زاروقطار روتے ہوئے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ ایک موٹر سائیکل سوار اسے ٹکر مار کر چلا گیا ہے، یہ تھرماس اور آئس کریم ایک کمپنی کی ہے اور وہ اجرت پر ان

کے لیے کام کرتا ہے، اس پر میں نے اس کی مدد کی مگر اُس سڑک پر سے گزرتے ہوئے تین چار بار اس معصوم بچے سے ملاقات ہوئی اور ہر مرتبہ اُس کی تھرماس سڑک پر ٹوٹی پڑی ہوتی تھی اور وہ ہچکیاں لے لے کر اپنی وہی داستان دہراتا تھا جو میں نے پہلی دفعہ اس سے سُنی تھی۔

رانا صاحب:

لاہور کے لوگ کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں، انہیں جب کھانے پینے سے فراغت ملتی ہے تو پھر کھانے پینے لگتے ہیں، لاہور کے ایک نواحی شہر گوجرانوالہ کے لوگ لاہوریوں سے بھی آگے ہیں، یہ کھانا تب چھوڑتے ہیں، جب تھک جاتے ہیں۔ اس شہر کے چڑے بہت مشہور ہیں۔ دور دراز کے شہروں کے لوگ حکیموں کے مشورے پر یہ چڑے کھانے کے لیے گوجرانوالہ کا رخ کرتے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے جو چڑے کھانے میں مشغول تھا اور جس کی اپنی جسامت چڑے سے زیادہ نہ تھی، پوچھا کہ اتنے چھوٹے سے پرندے میں آخر کھانے والی چیز کون سی ہوتی ہے؟ اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا ''چڑے کی ران'' اس شخص کے مقابل بیٹھا ہوا دوست اسے بار بار ''رانا صاحب'' کہہ کر مخاطب ہوتا تھا، شاید اس نام کا تعلق چڑے کی ران سے ہو!

فی سبیل اللہ:

مغرب میں نفسیاتی وجوہ کی بنا پر اذیت پسندی کا رجحان بڑھتا جارہا ہے بلکہ ہمارے ہاں یہ کام معاوضے پر کیا جاتا ہے۔ لوگ اس کام کے لیے مخصوص مقامات پر جاتے ہیں جہاں معاوضہ لے کر انہیں ہنٹر مارے جاتے ہیں۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ یہ رجحان پاکستان میں بھی موجود ہے، تاہم اس کی صورت قدرے مختلف ہے،

چنانچہ میں نے ایک بزرگ کے بارے میں سنا کہ وہ یہ کام فی سبیل اللہ کرتے ہیں فرق یہ ہے کہ لوگوں نے اس اذیت کے ساتھ یہ عقیدہ وابستہ کررکھا ہے کہ بزرگ جتنی زیادہ چھڑیاں ماریں گے چھڑیاں کھانے والے کو اتنا ہی زیادہ فائدہ بھی ہوگا۔ سنا ہے کہ پاکستان کے دو سابق وزرائے اعظم بھی چھڑیوں سے مستفید ہو چکے ہیں۔

ہاتھ کی صفائی:

پاکستان میں پیروں فقیروں کی بہت پذیرائی ہوتی ہے میں ایک پیر صاحب کے ڈیرے پر گیا۔ پیر صاحب بہت بڑے جاگیردار ہیں۔ ڈیرے پر ان کے مریدوں کا جمگھٹا تھا جو والہانہ طور پر ان کے ہاتھ چوم رہا تھا۔ پیر صاحب اس دوران مجھ سے آکسن لہجے کی خوبصورت انگریزی میں گفتگو کرتے رہے اور اپنا بایاں ہاتھ انہوں نے بے نیازی سے مریدوں کے بوسے کیلئے ان کی طرف پھیلائے رکھا۔ جب مرید اس اظہار عقیدت سے فارغ ہوئے تو پیر صاحب نے ٹشو پیپر سے ہاتھ کے اس حصے کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا جہاں ان کے مرید طبع آزمائی کرتے رہے تھے واضح رہے یہ پیر صاحب اپنے مریدوں سے باہر کے حلقے میں بھی ہاتھ کی صفائی کے لیے مشہور ہیں۔

باادب شوہر:

میں جب پاکستان گیا ان دنوں وہاں وظائف کے ورد کا رجحان بہت زیادہ تھا خصوصاً خواتین کا زیادہ وقت وظائف ہی میں گزرتا تھا۔ اس دوران میری ملاقات ایک پاکستانی شوہر سے ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جب بھی گھر میں جاتا ہے اس کی بیوی پورے جسم کو چادر میں لپیٹے ہاتھ میں تسبیح پکڑے مصلے پر بیٹھی ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر عجب طرح کا نور ہوتا ہے پورے گھر میں تقدس کی فضا کچھ اس طرح چھائی ہوتی ہے کہ وہاں فرشتوں کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی

بیوی کی پارسائی سے اس درجہ متاثر ہے کہ اب وہ صرف اس کے ہاتھ چومتا ہے اور وہ بھی اس احتیاط سے کہ بے ادبی کا احتمال تک نہ ہو۔

ذریعہ معاش:

ایک وقت تھا کہ لاہور میں ہیجڑے شادی بیاہ کے مواقع پر ناچ گا کر اپنی روزی کماتے تھے یا شام کو بناؤ سنگھار کر کے نہر والی سڑک پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک لاہوریئے نے جو اپوزیشن کی کسی جماعت کا کارکن تھا مجھے بتایا کہ اب یہ ہیجڑے بھیک مانگ کر گزارہ کرتے ہیں یا نہر والی سڑک پر کھڑے ہو کر صرف اس گاڑی میں بیٹھے ہیں جو اقتدار کے مرکز کی طرف جا رہی ہو۔ یہ بات شاید اس نے طنزیہ کہی تھی مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے سمجھ نہیں آئی کیونکہ اقتدار ذریعہ معاش کیسے ہو سکتا ہے؟

آؤٹ آف ڈیٹ لطیفہ:

مجھے ایک لاہوریئے نے ہیجڑوں کے حوالے سے ایک لطیفہ بھی سنایا جس کے مطابق ایک ہیجڑے کا انتقال ہوا تو فرشتے قبر میں آئے اور کہا: ''حساب دو'' اس پر ہیجڑے نے جل کر کہا: ''مجھے دیا کیا تھا جس کا حساب لینے آئے ہو''؟ لیکن یہ لطیفہ اس صورت میں آؤٹ آف ڈیٹ لگتا ہے اگر اس لاہوریئے کی بات کو سامنے رکھا جائے جو اس نے اوپر والے پیرے میں بیان کیا ہے کیونکہ اس میں صورتحال بالکل مختلف بیان کی گئی ہے۔

حفظ ماتقدم:

پاکستان میں قیام کے دوران ایک مرتبہ ایک لاہوریئے کی گفتگو نے مجھے پریشان کر دیا۔ اس نے مجھے کہا: ''تمہاری بہن مجھ سے کہہ رہی تھی کہ تم رات کو لیٹ کیوں

آتے ہو؟ میں تمہارا انتظار کرتے کرتے سو جاتی ہوں'' ظاہر ہے یہ بات میرے لئے پریشان کن تھی کہ میری بہن نہ صرف یہ کہ مجھے اطلاع دیئے بغیر پاکستان چلی آئی بلکہ اس نے یہاں آتے ہی ایک اجنبی سے اتنے گہرے تعلقات بھی قائم کر لیے کہ اب وہ راتوں کو اس کا انتظار کرنے لگی ہے۔ مجھے اس کے تعلقات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ یہ فرد کی آزادی کا مسئلہ ہے مگر غصہ اس بات پر تھا کہ اس نے اس سارے معاملے سے مجھے بے خبر رکھا تاہم یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی بیوی کو میری بہن محض یگانگت کے اظہار کیلئے کہہ رہا تھا یا پھر اس کا مقصد تھا کہ میں اس کی بیوی کو اپنی بہن ہی سمجھوں۔

آم پولا کرنا:

پاکستان میں ایک بہت لذیذ پھل پایا جاتا ہے جسے آم کہتے ہیں اسے لالی پاپ کی طرح چوسا جاتا ہے اور چوسنے سے پہلے اسے ''پولا'' کرتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ اسے دونوں جانب سے آہستہ آہستہ دبایا جاتا ہے اور یوں اس کا رس چوسنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ کئی لوگ آم پولا کر کے کسی دوسرے کو چوسنے کیلئے دے دیتے ہیں اور یہ قربانی ان کی ترقی کے رستے کھول دیتی ہے۔ میں نے ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ ہر وقت خواتین کے جمگھٹے میں رہتے ہیں میں نے ایک لاہوریئے سے پوچھا کہ یہ صاحب کیا کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: ''کچھ نہیں صرف آم پولا کرتے ہیں''۔

منے کے ابا:

پاکستان کے قدامت پرست گھرانوں میں بیوی اپنے شوہر کا نام زبان پر نہیں لاتی بلکہ اسے منے کے ابا کہہ کر بلاتی ہے جبکہ ہمارے ہاں یہ To Whom it may concern کی ذیل میں آتا ہے۔

لاہور کے شادی گھر:

یوں تو لاہور میں بہت سے شادی گھر ہیں تاہم ان میں سے مشہور ترین شادی گھر لاہور کے فائیو سٹار ہوٹل ہیں۔ دوپہر اور رات کے اوقات میں یہاں بہت رش ہوتا ہے۔ یہاں باراتیوں کے علاوہ بھی دوسرے لوگ زرق برق کپڑے پہنے آتے ہیں اور کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں۔ لڑکے والے سمجھتے ہیں یہ لڑکی والوں کے مہمان تھے اور لڑکی والے انہیں باراتی سمجھ کر ان کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ داتا دربار کے بعد یہ دوسری جگہ ہے جس کے لنگر سے روزانہ بیسیوں مسکین اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔ ان شادی گھروں میں ریستوران، ڈائننگ ہال اور رہائشی کمرے بھی ہیں اور یوں ان کی حیثیت ہوٹل کی بھی ہے۔ تاہم زیادہ تر یہ بطور شادی گھر استعمال ہوتے ہیں!

فلم اسٹوڈیو:

لاہور پاکستان کا ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں بہت سے فلم اسٹوڈیو ہیں جن میں بیک وقت ایک ہی فلم بنتی ہے۔ اس فلم کی کاسٹ بھی عموماً تبدیل نہیں ہوتی۔ دس پندرہ برس بعد ہیروئن بدل جاتی ہے البتہ ہیرو ایک ہی رہتا ہے۔ جو ایک خوبرو ہیرو کا رول بھی ادا کرتا ہے کالج اسٹوڈنٹ کا بھی اور ڈریکولا کا بھی۔ اور ہر کردار میں سپر ہٹ جاتا ہے۔ اس میں اس کا کوئی کمال نہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ ناظرین کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں مسلسل ”نظر بندی“ کی وجہ سے یہ ناظرین سیاست میں بھی ہیرو اور ولن کے فرق کو بھول گئے ہیں!

سیاسی رہنما:

لاہور سیاست کا گڑھ ہے لیکن یہاں سیاست دان دوسرے صوبوں یا شہروں سے

منگوائے جاتے ہیں اور ان کی بہت آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ یہاں بہت عرصے سے کوئی مقامی سیاست دان پیدا نہیں ہوا جو چھوٹے موٹے سیاست دان ہیں بھی ان کا دائرہ اثر لاہور کارپوریشن کی حدود تک ہے۔ لاہور نے بہت عرصے کے بعد ایک مقامی سیاست دان پیدا کیا ہے جس کا دائرہ اثر چاروں صوبوں میں موجود ہے مگر یہ سیاست دان بھی ہر ہفتے لاہور دوڑ آتا ہے۔ باقی صوبے والے اس کی راہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ وہاں صرف اس وقت جاتا ہے جب وہاں کسی خاتون کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔

اخبارات:

اخبارات کی تعداد اور ان کی سرکولیشن کے لحاظ سے لاہور پاکستان کے تمام شہروں سے آگے ہے۔ لاہور سے جو اخبارات نکلتے ہیں ان میں اہم سے اہم خبر کی پہلی سطر صفحہ اول اور باقی ساری خبریں صفحہ سات پر بقیوں والے حصے میں شائع ہوتی ہے چنانچہ قاری سارا وقت پہلے اور ساتویں صفحے کا پینڈا طے کرنے میں ہی مشغول رہتا ہے اور یوں اخبار والے خبر میں چھپی خبر سے اس کا دھیان ہٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لاہور سے شائع ہونے والے اخباروں میں کالی ریورسیں بہت نکالی جاتی ہیں۔ ریورسوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کسی اخبار کو زرد صحافت کا طعنہ دینا ممکن نہیں رہتا، اسے زیادہ سے زیادہ کالی صحافت کہا جا سکتا ہے۔ اخباروں کی شہ سرخیاں دمادم مست قلندر، جیرا آ گیا میدان میں، ہے جمالو، اوئے تیری لاش نوں مچھیاں ای کھان گیاں۔ قسم کی ہوتی ہیں جو بہت پسند کی جاتی ہیں۔ پولیس، کسٹم، ایف، آئی اے، انکم ٹیکس، ایکسائز اور فضل ربی والے دوسرے محکموں کی طرح اخبار میں کام کرنے والوں کی تنخواہیں بھی کم ہوتی ہیں۔ البتہ کچھ عرصے سے بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لیے بھی اخبارات نکالے جا رہے ہیں۔ جس سے کارکنوں کو بھی بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔

مذہبی جماعتیں:

لاہور میں تمام مذہبی جماعتوں کے دفاتر موجود ہیں۔ ان جماعتوں کا عہدیدار کوئی بھی باریش شخص ہوسکتا ہے۔ مذہبی جماعتیں لوگوں کی مذہبی تربیت کی طرف بہت توجہ دیتی ہیں چنانچہ مختلف اسٹکرز چھپوا کر کاروں پر ان کے مالکوں سے پوچھے بغیر چسپاں کرادیئے جاتے ہیں۔ ان اسٹکروں پر یارسول اللہ، یاعلی مدد اور یااللہ لکھا ہوتا ہے۔ دراصل ان اسٹکروں سے مختلف فرقوں کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ مذہبی جماعتیں مذہب کے فروغ کے علاوہ باقی سب خدمات انجام دیتی ہیں۔

مساجد:

استنبول کے بعد لاہور دوسرا شہر ہے جسے مساجد کا شہر کہا جاسکتا ہے۔ مسجد کسی بھی خالی پلاٹ پر اس کے مالک کی مرضی کے بغیر بنائی جاسکتی ہے۔ اور جب ایک دفعہ مسجد بن جائے کوئی مائی کالال اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں لب کشائی نہیں کرسکتا۔ ان مسجدوں میں اہلِ محلہ کے اعصاب کو مضبوط بنانے کیلئے چاروں طرف لاؤڈ اسپیکر لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ کسی کافر ملک سے جہاد کی صورت میں عوام بموں کے دھماکوں سے پریشان نہ ہوں۔ ان لاؤڈ سپیکروں سے چندہ بھی طلب کیا جاتا ہے۔ اور چندہ دینے والوں کے ناموں کا اعلان بھی ہوتا ہے جو لوگ چندہ نہیں دیتے باقی تینوں لاؤڈ سپیکروں کا رخ بھی ان کے گھر کی طرف کردیا جاتا ہے۔

پبلشنگ کے ادارے:

لاہور میں بے شمار پبلشنگ کے ادارے ہیں چنانچہ کوئی بھی مصنف بآسانی اپنی کتاب شائع کرا سکتا ہے۔ پبلشر حضرات نے اس کیلئے بہت آسان طریقہ کار رکھا

ہے۔ یعنی مصنف کتاب کی اشاعت کے تمام اخراجات پبلشر کو ادا کردیتا ہے چنانچہ اس کی کتاب شائع ہوکر مارکیٹ میں آجاتی ہے۔ یہ پبلشر حضرات مصنف کو باقاعدہ رائلٹی بھی ادا کرتے ہیں اور یہ رائلٹی دس کتابوں کی صورت میں ہوتی ہے جو مصنف کی رقم سے شائع شدہ کتابوں میں سے دس کتابوں کا پیکٹ بنا کر اسے پیش کردی جاتی ہے۔

احتجاجی جلوس:

لاہور میں احتجاجی جلوس بہت نکلتے ہیں۔ ان جلوسوں کیلئے حکومت نے شاہراہ قائداعظم کو مخصوص کیا ہوا ہے جہاں چند تاجر حضرات ناجائز طور پر اپنی دکانیں سجائے بیٹھے ہیں جو ان جلوسوں کے موقع پر عموماً لوٹ لی جاتی ہیں یا جلا دی جاتی ہیں۔ جلوس کے شرکا قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے بھی اگر کوئی جلوس نکالیں تو قومی املاک کو ضرور نذر آتش کرتے ہیں۔ شاہراہِ قائداعظم پر جب کوئی احتجاجی جلوس نمودار ہوتا ہے ٹریفک پولیس ٹریفک کا رخ اردگرد کی گلیوں میں موڑ دیتی ہے اور اس کے بعد بیلٹ ڈھیلی کرکے ٹوپی اتار کر بھنگیوں کے توپ پر بیٹھ جاتی ہے اور سگریٹ کے کش لگانے لگتی ہے البتہ امریکہ کے خلاف نکالے جانے والے جلوسوں کو منتشر کرنا بہت آسان ہے۔ اس کیلئے ٹریفک کو گلیوں میں موڑنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس موقع پر اگر میگا فون کے ذریعے صرف یہ اعلان کردیا جائے کہ جو حضرات امریکہ کا ویزہ لینے کے خواہش مند ہوں وہ ایک طرف ہوجائیں تو اس کے بعد جلوس میں جو چیز نظر آئے گی اسے آسان اردو میں بھگدڑ کہا جاتا ہے۔

نیچرل کھانے:

لاہور میں جو علاقہ کھانے پینے کیلئے مشہور ہے، اس کا نام لکشمی چوک ہے یہاں کھانے پینے کی جو اشیا تیار ہوتی ہیں، اس میں مصالحوں کے علاوہ بھی بہت کچھ ڈالا

جاتا ہے جس سے ان کی لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دکاندار تیار شدہ کھانے بڑے بڑے دیگچوں میں عین سڑک کے کنارے واقع اپنی دکان کے تھڑے پر سجا دیتا ہے اور ان کے ڈھکنے اتار کر پرے رکھ دیتا ہے، چنانچہ ڈیزل موبل آئل، ہوا میں اڑتے ہوئے گوبر کے اجزا، مٹی اور دھواں وغیرہ اس خوراک میں، شامل ہو جاتے ہیں جس کا کوئی اضافی معاوضہ گاہک سے وصول نہیں کیا جاتا اور یوں کھانا مفت میں مزیدار ہو جاتا ہے۔ یہ بات میرے دوست نے میرے اس سوال کے جواب میں بتائی تھی کہ لوگ یہ کھانے کس طرح کھاتے ہیں جن میں اتنے سارے گند کی ملاوٹ ہو۔ دوست کی دلیل یہی تھی کہ گھر میں پکے ہوئے کھانوں کی نسبت ان کھانوں کے زیادہ لذیز ہونے کی وجہ ہی یہی ہے کہ گھر کے کھانوں میں یہ قدرتی اجزا شامل نہیں ہوتے، دوسرے اس سے معدے کا دفاعی نظام مضبوط ہوتا ہے ـــ میں نے دوست سے پوچھا تمہیں کس قسم کے کھانے پسند ہیں۔ اس نے کہا ''مجھے وہ تمام کھانے پسند ہیں جنہیں وہی لوگ مضرِ صحت کھانے کہتے ہیں، میں انہیں نیچرل کھانے کہتا ہوں کیونکہ ان میں نیچر کے اجزا شامل ہوتے ہیں!''

اصلی وجہ؟

جب میں پاکستان آیا مسلمانوں کا ایک تہوار جسے وہ بڑی عید کہتے ہیں، قریب تھا، اس دن مسلمان بکرے کی قربانی دیتے ہیں، قربانی کے بعد کئی لوگ کھال بیچ دیتے ہیں۔ اور گوشت فریزر میں ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ میں اپنے دوست کے ساتھ بکرا خریدنے گیا، میرے دوست نے ایک مریل سے دنبے پر ہاتھ رکھا اور مالک سے پوچھا ''یہ سچ مچ کا دنبہ ہے یا اسے مار مار کر دنبہ بنایا ہے''؟ جس پر ارد گرد کھڑے لوگ ہنس پڑے مگر مجھے ان کے ہنسنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ میرے دوست نے اس جملے کے مختلف ترجمے

کیے بالآخر کہنے لگا اس کا ترجمہ ممکن نہیں۔۔۔ یقیناً یہ کوئی مقامی محاورہ ہوگا، جس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا!

عید کی نماز:

میرا یہ دوست مجھے عید کی نماز پڑھنے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا مجھے نماز پڑھنی نہیں آتی، اس نے کہا کوئی بات نہیں، عید کی نماز کسی کو بھی پڑھنی نہیں آتی۔۔۔ عجیب بات ہے حالانکہ یہ لوگ سال میں دو دفعہ عید کی نماز پڑھتے ہیں۔

بولنے والا بکرا:

میں نے ایک بکرا دیکھا جس نے گوٹی کنارے کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا، گلے میں زیور تھے، پاؤں میں پازیبیں تھیں اور اس کے پیٹ پر مہندی سے کچھ لکھا ہوا تھا، دوست نے بتایا یہ ''عید مبارک'' لکھا ہوا ہے اور اسے داتا صاحب سلام کے لیے لے جا رہے ہیں، داتا صاحب کے متعلق پتہ چلا کہ وہ بہت بڑے سینٹ ہیں۔ میں نے دوست سے پوچھا کیا یہ بولنے والا بکرا ہے؟ دوست اس پر ہنس پڑا اور کہا ''سارے بکرے بولتے ہیں، قصائی کو دیکھ کر تو چلاتے بھی ہیں'' دوست غالباً میری بات نہیں سمجھا تھا یا کوئی بات چھپانا چاہتا تھا کیونکہ میرا اصل سوال یہ تھا کہ اگر یہ سلام کرنے جا رہا ہے تو کیا یہ ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہے گا یا محض اشارے سے سلام کرے گا۔۔۔ میرے خیال میں دونوں صورتیں ممکن ہیں کیونکہ مشرق اپنی روحانیت کیلئے مشہور ہے۔

پیش گوئی:

میرا دوست مجھے ایک دن اپنے ساتھ داتا دربار لے گیا، وہاں ایک ملنگ نے جس نے ہاتھ میں کڑے، گلے میں مالائیں اور سبز کپڑے پہنے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہی

پہلے ایک نعرہ لگایا اور پھر کچھ کہا۔ میرے دوست نے بتایا کہ اس نے تمہارے بارے میں پیش گوئی کی ہے کہ کل تمہیں خوشی ملے گی۔۔۔ اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اگلے روز ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "میرا نام خوشی محمد ہے" مشرق واقعی مشرق ہے، ہم مغرب کے لوگ اس کی پراسراریت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے!

مجبوری:

پاکستان میں میری ملاقاتیں سیاست دانوں اور صحافیوں سے بھی ہوتی رہیں۔ یہ لوگ بڑے وسیع القلب ہیں، غیرملکیوں کے سامنے ہی اپنے ملک کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ سیاستدانوں کے حوالے سے میں نے ایک عجیب بات محسوس کی اور وہ یہ کہ ان کی اکثریت اشاروں کنایوں میں خود کو جی ایچ کیو یا امریکہ کا بندہ ثابت کرتی ہے، حکمرانوں کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھی گفتگوؤں میں اسی قسم کے اشارے دیتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر میرے دوست نے بتایا کہ یہ ان کی مجبوری ہے کیونکہ ہمارے ہاں حکومت میں آنے یا حکومت میں رہنے کیلئے جی ایچ کیو اور امریکہ کی اشیر باد ضروری سمجھی جاتی ہے!

امریکی سفیر:

میرا ایک دوست مجھے ایک اپوزیشن لیڈر کے پاس لے گیا، اس نے میری بہت آؤ بھگت کی اور میرے کچھ پوچھے بغیر پاکستان کی خرابیاں گنوانا شروع کر دیں اور تان اس پر توڑی کہ ان خرابیوں کا حل صرف اس کی جماعت کے پاس ہے۔ اس دوران اسے انٹرکام پر ایک پیغام موصول ہوا جس کے جواب میں اس لیڈر نے کچھ کہا۔۔۔ بعد میں میرے دوست نے مجھے بتایا کہ اسے پیغام ملا تھا کہ باہر پارٹی کے کارکن

ملاقات کے انتظار میں بیٹھے ہیں جس کے جواب میں اس نے کہا کہ انہیں کہو کہ وہ انتظار کریں، میں اس وقت امریکی سفیر کے ساتھ بیٹھا کچھ ضروری امور پر تبادلہ خیال کر رہا ہوں۔ دوست نے بتایا کہ اس نے یہ بات بہت آہستہ کہی تھی مگر میں نے سن لی تھی۔ میں بہرحال اپنے مرتبے میں اس اچانک اضافے پر بہت خوش ہوا!

تیسری دنیا کے ممالک:

جو دوست مجھے اس لیڈر کے پاس لے گیا تھا، وہ خود بھی بہت کائیاں تھا اور لیڈروں پر اپنے تعلقات کا رعب جما کر ان سے کام نکلواتا تھا۔ میں کہیں اس کے سامنے کہہ بیٹھا کہ پاکستان میں امریکی سفیر میرے کالج کے زمانے کا دوست ہے، اس پر یہ اگلے روز حکمران سیاسی پارٹی کے ایک لیڈر کو میرے پاس لایا اور درخواست کی کہ اس کی ایک خفیہ ملاقات امریکی سفیر سے کرائی جائے۔ میرا تو پاکستان کے دورے کا مقصد ہی پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جاننا تھا تا کہ واپسی پر کتاب لکھ سکوں چنانچہ میں اس لیڈر کو اپنے دوست امریکی سفیر کے پاس لے گیا کہ دیکھیں خفیہ ملاقاتوں میں یہ لوگ کس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو حکمران سیاسی پارٹی کے اس لیڈر نے بالواسطہ طور پر اور بہت محتاط لفظوں میں امریکی سفیر سے کہا کہ وہ اسے پاکستان میں سی آئی اے کا ایجنٹ مقرر کر دیں۔ اس پر میرے سفیر دوست نے بہت شائستگی سے کہا کہ تم میرے ایک عزیز دوست کے ساتھ آئے ہو، میں تمہارا کام ضرور کرتا مگر پرابلم یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں سی آئی اے کا ایجنٹ صرف اس ملک کا سربراہ ہوتا ہے! میرے خیال میں میرے سفیر دوست نے یہ بات محض ٹرخانے کیلئے کہی تھی کیونکہ ممکن ہے ساری اسامیاں پُر ہو گئی ہوں۔

خصوصی اہتمام:

میں ابھی پاکستان میں ہی تھا کہ حسب معمول وہاں مارشل لاء لگ گیا، اتفاق سے اسی دن میری ملاقات ایک لیڈر سے طے تھی، دوران ملاقات موبائل فون کی گھنٹی بجی اور پھر یہ لیڈر میری موجودگی سے بالکل بے نیاز ہو کر آدھ گھنٹہ تک مسلسل باتیں کرتا رہا۔ جب اس نے بات ختم کی تو مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''معافی چاہتا ہوں، مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا فون تھا، وہ کچھ ضروری مشورے کرنا چاہ رہے تھے'' میں نے حیران ہو کر پوچھا ''سارے ملک میں موبائل فون جام کر دیے گئے ہیں، آپ کا فون کیسے آ گیا'' اس پر وہ کچھ پریشان ہوا مگر پھر سنبھل کر بولا ''میرے لئے خصوصی ٹیلی فون لائن کا بندوبست کیا گیا تھا'' شاید وہ ٹھیک کہتا ہو، کیونکہ مارشل لاء ایک غیر فطری نظام ہے اور یوں اس میں ہر غیر فطری اور ناممکن چیز ممکن ہے!

غیر معقول وجہ:

میں ایک روز اپنے ایک پاکستانی میزبان کے گھر دعوت پر گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اس کا ایک بارہ چودہ سالہ بچہ بہت سہما ہوا تھا، میں نے اس کی وجہ اپنے میزبان سے دریافت کی تو اس نے کہا ''اس کا یہ سہم اور خوف مارشل لاء کی وجہ سے ہے'' میں نے پوچھا ''اس معصوم بچے کو مارشل سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے'' میزبان نے جواب دیا ''یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہ اس طرح کے سوال کے جواب میں کہتا ہے، میں نے پہلے مارشل لاء کے بارے میں صرف سنا ہوا تھا، لیکن دیکھا اب ہے!'' مجھے یہ وجہ کوئی اتنی معقول نظر نہیں آئی۔ دراصل کچھ پاکستانی ایسے بھی ہیں جو میرے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے مجھ سے بہت سی باتیں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں!

بغیر خبروں والے اخبار:

میں ایک کافی ہاؤس میں کافی پینے کے لیے گیا تو وہاں اردو کا ایک اخبار میز پر دھرا تھا، اس میں ایک ایک صفحے پر کئی کئی تصویریں تھی، ان تصویروں میں سے میں صرف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی تصویر پہچانتا تھا، مجھے تجسس ہوا کہ پتہ کروں کہ اس کی تصویر اگر شائع ہوئی ہے تو اس نے کیا کہا ہے یقیناً کوئی بہت اہم بات کی ہو گی۔ کافی ہاؤس میں برابر کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے ایک پاکستانی سے میں نے اس کی بابت دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے آنے والے دنوں کیلئے اپنے پروگرام کا اعلان کیا ہے۔ میں نے پوچھا اس کے علاوہ کیا کہا ہے، پاکستانی نے جواب دیا، اس کے علاوہ تو کچھ نہیں کہا۔ اس پر میں نے پوچھا ''پھر یہ بیان خبر کے طور پر کیسے شائع ہوا، اس میں خبر کہاں ہے یہ تو پراپیگنڈہ ہے'' بیچارہ پاکستانی میری اس حیرت پر حیران رہ گیا! شاید یہ لوگ بیانات ہی کو خبر سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ باقی صفحوں پر بھی اسی طرح کی ''خبریں'' تھیں جو وزیروں اور لیڈروں کے بیانات پر مشتمل تھیں۔ پاکستان شاید دنیا کا واحد ملک ہے جہاں اکثر اخبارات بغیر خبروں کے شائع ہوتے ہیں!

عوامی اخبار:

اسی اخبار کا فرنٹ پیج اور بیک پیج مختلف قسم کی تصویروں اور خبروں سے بھرا ہوا تھا، برابر والی ٹیبل پر بیٹھے پاکستانی نے مجھے بتایا کہ یہ عوام کے مختلف طبقوں جن میں اپوزیشن رہنما، اداکارائیں اور کاروباری افراد وغیرہ شامل ہیں، کے بارے میں سکینڈلز کی خبریں اور تصویریں ہیں، میں نے پوچھا کیا یہ شام کا اخبار ہے، اس نے کہا نہیں، میں بہت حیران ہوا کیونکہ ہمارے ہاں سنسنی خیز جرائم اور سکینڈل کی خبریں صرف شام کے اخبار شائع کرتے ہیں جو ہمارے عوام شوق سے پڑھتے ہیں، اس سے

مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستان کی قومی صحافت بھی عوام کی پسند اور ناپسند کا کس درجہ خیال رکھتی ہے!

اللہ لوک:

ہم یورپین لوگ موت سے زیادہ خوفزدہ رہتے ہیں جبکہ پاکستانی قوم کے دل کے کسی گوشے میں مجھے موت کا خوف نظر نہیں آیا یہ بہادر لوگ ہر محاذ پر اپنی جواں مردی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ خصوصاً تیز رفتار ٹریفک والی سڑک پر جس اطمینان قلب کے ساتھ یہ لوگ سڑک پار کرتے ہیں، اسے دیکھ کر کار کی چیخیں نکل جاتی ہیں، مگر ان کے چہرے پر جو سکون نظر آتا ہے، وہ اپنے ہاں صرف کسی بڑے "سینٹ" ہی کے چہرے پر دکھائی دے سکتا ہے۔ سینٹ کو یہاں "اللہ لوک" کہتے ہیں۔

باکمال معاشرہ:

ہمارے ہاں مصروف سڑکوں کی وجہ سے اور کچھ بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کی بنا پر ڈرائیونگ کے دوران لوگ ایک دوسرے سے ہیلو ہیلو بھی نہیں کر پاتے جبکہ یہاں حکومت نے میل ملاپ اور محبت کو فروغ دینے کی غرض سے کار ڈرائیوروں کے لیے ڈیٹنگ پوائنٹ بنائے ہوئے ہیں جن کے لیے چوراہوں کا انتخاب کیا گیا ہے، مَیں نے کئی دفعہ دیکھا کہ آمنے سامنے سے دو گاڑیاں آرہی ہیں، دونوں کے ڈرائیور ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور پھر اپنی اپنی گاڑیاں وہیں چوراہے میں روک کر باہر نکلتے ہیں اور ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں اور بھولی بسری یادیں دہرانے لگتے ہیں۔ اس دوران اگرچہ ٹریفک جام بھی ہو جاتا ہے اور بعض مادہ پرست قسم کے لوگ ہارن بجا کر اپنی بے صبری اور بے مروتی کا اظہار بھی کرتے ہیں مگر ان دوستوں کی گفتگو میں خلل نہیں پڑتا۔ بڑا کمال کا معاشرہ ہے۔

باہمی تعاون:

مَیں نے لاہور میں قیام کے دوران ایک اور چیز نوٹ کی، وہ مقامی لوگوں کے درمیان باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کی فضا تھی، جو بدقسمتی سے ہم یورپ والوں میں مفقود ہوتی جارہی ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک ہی سڑک پر آمنے سامنے سے سر پا لدے ہوئے ریڑھے، تانگے، کاریں، ویگنیں، ٹرک، موٹر سائیکل، سائیکل اور پیدل سوار ایک دوسرے میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ ابھی کوئی گاڑی کسی گاڑی سے ٹکرا جائے گی مگر اس سے پہلے ان میں سے کوئی ایک اپنی گاڑی کو فوراً دائیں یا بائیں جانب (دیکھے بغیر) موڑ دیتا ہے اور اس جانب کی کوئی گاڑی بھی فوری تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ آپ پیدا کرنے کی کوشش میں ادھر ادھر ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ صورت ایک دن بھی پیدا ہو جائے تو اعصابی طور پر کمزور ہماری قوم کے افراد اگلے دن دماغی ہسپتال میں پہنچ جائیں۔ ممکن ہے یہ لوگ بھی دماغی ہسپتال سے ہو آئے ہوں اور ڈاکٹروں نے انہیں تندرست قرار دے دیا ہو۔

لذیذ مشغلہ:

ہمارے ہاں اگر کوئی ٹریفک کی خلاف ورزی کرے تو لوگ اپنے غصے کا اظہار ہارن بجا کر کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں ہارن کی آواز کبھی کبھار ہی سنائی دیتی ہے جبکہ لاہور میں قیام کے دوران مَیں نے دیکھا کہ لوگ شوقیہ ہارن بجاتے ہیں اور بجائے چلے جاتے ہیں۔ یہاں ہارن کی مختلف ورائٹیاں پائی جاتی ہیں۔ کچھ میوزیکل ہیں۔ کچھ سادے ہیں اور زیادہ تر پریشر ہارن ہیں جو عموماً بسوں اور ٹرکوں میں فٹ ہوتے ہیں۔ یہ جب آپ کے قریب پہنچ کر اچانک ہارن بجاتے ہیں تو لگتا ہے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ صرف کانوں میں کھجلی سی ہونے لگتی

ہے۔ چنانچہ یہ کھجلی دور کرنے کے لیے کانوں میں جب کاٹن بڈ یا ماچس کی تیلی پھیری جاتی ہے تو بہت مزا آتا ہے۔ جب میں وطن واپس جاؤں گا تو اس لذت کے لیے ترستا رہ جاؤں گا۔

محبت کرنے والی قوم:

پاکستانی بہت محبت والے لوگ ہیں۔ یہ مختلف تہواروں پر ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں جس سے فطری طور پر باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، اس ضمن میں چھوٹے بڑے میں بھی کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا چنانچہ اکثر ماتحت گاہے گاہے اپنے افسروں کے لیے تحفے لے کر جاتے ہیں۔ ان میں کار کی چابی اور بقرعید پر بکروں کے تحفے بھی شامل ہیں۔ تحفے دینا پاکستانیوں کے کلچر میں شامل ہے۔ حتیٰ کہ راہ چلتے ہوئے اگر کوئی ٹریفک کا اہلکار انہیں روکتا ہے تو یہ اسے بھی کچھ نہ کچھ ضرور تھما دیتے ہیں۔

لکڑ ہضم، پتھر ہضم:

مَیں نے چینیوں کے ''سب ہضم'' کے بارے میں سنا تھا کہ وہ فضا میں اڑنے والی ہر چیز سوائے ہوائی جہاز کے، پانی میں تیرنے والی ہر چیز سوائے بحری جہاز کے اور زمین پر رینگنے والی ہر چیز سوائے انسان کے کھا جاتے ہیں۔ جس طرح مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی اسی طرح پاکستانیوں کی خوراک کے بارے میں جان کر بھی حیران ہوا۔ وہ گوشت اور اس سے جڑی ہوئی ہر چیز بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ مَیں نے لکشمی چوک میں کئی دکانیں دیکھیں، جہاں کئی لوگ جانوروں کے ''اعضائے رئیسہ'' کھلم کھلا کھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں گائے کی زبان، جس سے ہر وقت رال ٹپکتی رہتی ہے، یہاں بہت شوق سے کھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ گائے کا تالو، جسے مقامی زبان میں ''کھد'' کہا جاتا ہے لوگ مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ بلکہ ایک

دوست نے بتایا کہ کئی لوگ ''اوجھڑی'' بھی کھاتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر جب اس نے اوجڑی کے بارے میں بتایا کہ یہ گائے کے کس حصے کو کہتے ہیں اور اس نے مجھے پکی ہوئی دکھائی بھی، تو مَیں نے گھبرا کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کے بعد مَیں نے پاکستانی خوراک کی تفصیل نہیں پوچھی۔ یہ لوگ سب کچھ کھا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ دماغ بھی کھاتے ہیں۔

پسندیدہ سبزی:

دراصل پاکستانی گوشت کے بہت شوقین ہیں، پاکستان بنانے کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی، مَیں نے ایک دوست سے پوچھا: ''تمہیں سبزیوں میں سے کون سی سبزی سب سے زیادہ پسند ہے؟'' بولا ''سبزیوں میں سے میری پسندیدہ سبزی گوشت ہے''۔

حلال گوشت:

ہمارے ہاں یہودی کوئی جانور ذبح کرنے سے پہلے مقدس کلمات ادا کرتے ہیں جو جانور اس کے بغیر ذبح کیا جائے وہ اسے حرام سمجھتے ہیں۔ پاکستانی مسلمان بھی اس سلسلے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔ میرا مقامی دوست مرغی کا گوشت خریدنے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ دکاندار کے پاس پہلے سے ذبح شدہ گوشت موجود تھا مگر میرے دوست نے وہ نہیں خریدا، اسے شبہ تھا کہ خدا جانے اسے ذبح کرتے وقت مقدس کلمات پڑھے گئے تھے کہ نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے سامنے مرغی ذبح کرنے کے لیے کہا۔ دکاندار نے مرغی ذبح کرنا شروع کی تو میرا دوست، مرغی خریدے بغیر وہاں سے چل دیا۔ مَیں نے وجہ پوچھی تو بولا: ''یہ حرام خور مرغی ذبح کرتے وقت مقدس کلمات پڑھنے کی بجائے اپنے ساتھی کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا'' بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اکثر ایسے ہی ہوتا ہے۔

حلال حرام:

صرف پاکستان میں رہنے والے پاکستانی ہی نہیں بلکہ یورپ میں جو پاکستانی آباد ہیں وہ بھی گوشت کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں چنانچہ ہمارے ہاں اب جگہ جگہ حلال گوشت کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ مَیں نے بیک ہوم میں اپنے ایک پاکستانی بزنس پارٹنر کو ایک دفعہ اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا، جب ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تو میں نے اسے بتایا کہ جو گوشت تمہارے سامنے ہے وہ میں نے ایک حلال گوشت کی دکان سے خریدا تھا مگر اس کے باوجود اس نے خرابیِ معدہ کا بہانہ بنا کر گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بلکہ سلاد کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ میرے اس پاکستانی دوست پر ایک مقامی عدالت میں دس ملین پاؤنڈ کے فراڈ کا مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے پہلے بتایا تاں کہ پاکستانی مسلمان زیادہ تر گوشت کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں حساس واقع ہوئے ہیں۔

پرہیزگار پاکستانی مسلمان:

مَیں اسلام کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن میرا اندازہ ہے کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ نفرت انگیز چیز اور سب سے بڑا گناہ وہ گوشت کھانا ہے جس پر مقدس کلمات نہ پڑھے گئے ہوں، اس کا اندازہ ابھی بیان کردہ واقعہ کے علاوہ مجھے اس وقت بھی ہوا جب بیک ہوم میں میرا ایک پاکستانی دوست، جس کے ساتھ میری بہت بے تکلفی ہے شام کو میرے گھر آیا، وہ شراب کے نشے میں دھت تھا اور میری ایک ہم وطن لڑکی اس کی بغل میں تھی۔ آتے ہی کہنے لگا "مجھے سخت بھوک لگی ہے، کھانے کے لیے کچھ ہے تو نکالو" مَیں نے فریج میں سے بکرے کے گوشت کی ایک ڈش نکالی اور اسے اوون میں گرم کرنے لگا تو اس نے لڑکھڑائی ہوئی زبان میں کہا "یہ رہنے دو میں

ڈبل روٹی پنیر کھالوں گا" مجھے یقین ہے یہ پرہیزگار پاکستانی مسلم بھی صرف مشکوک گوشت سے بچنا چاہتا تھا۔

سپر پاور:

قیامِ پاکستان کے دوران مجھے ایک بقرعید جیسے پاکستانی بڑی عید کہتے ہیں لاہور میں گزارنے کا اتفاق ہوا، یہ میری زندگی کا ایک بہت دلچسپ تجربہ تھا۔ مسلمان اس عید پر بکرے کی قربانی دیتے ہیں میں نے مقامی علما سے اس کا مقصد پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ بکرے کی قربانی ایک علامتی چیز ہے، اس کا اصل مقصد مسلمان قوم کو ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار کرنا ہے جس میں جان و مال اور نفس کی قربانی بھی شامل ہے۔ مجھے یہ بات اچھی لگی۔ دنیا میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے زیادہ ہے۔ یقیناً یہ سب بکرے کی قربانی کے علاوہ جان و مال اور نفس کی قربانی بھی دیتے ہوں گے۔ میرے علم میں تو نہیں، لیکن اس سے لگتا ہے کہ متذکرہ جذبے پر عمل کرنے کے نتیجے میں امریکہ کی بجائے مسلمان قوم اس وقت تک دنیا کی سپر پاور بن چکی ہوگی۔

مذہبی رسم؟:

مَیں نے عید کے تین دن اپنے ایک مقامی دوست کے ساتھ مختلف مقامات پر گزارے۔ مَیں ایک سیاستدان کے گھر میں گیا جو الیکشن میں ہار گیا تھا وہ اس وقت قربانی کی رسم ادا کرنے کی تیاریوں میں مشغول تھا، اس نے چھری تیز کر کے قصاب کے ہاتھ میں پکڑائی اور اس کے ساتھ مل کر بکرے کو زمین پر لٹادیا، جب قصاب بکرے کی گردن میں چھری پھیرنے لگا تو اس سیاست دان نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مَیں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ قصاب کے ہاتھ میں چھری پکڑانا، اس کے ساتھ

مل کر زمین پر گرانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بکرے کی گردن پر چھری پھیرتے وقت منہ دوسری طرف پھیر لینا، کیا یہ کوئی مذہبی رسم ہے؟ دوست نے کہا یہ مذہبی نہیں، سیاسی رسم ہے----میں نے اس کی تفصیل نہیں پوچھی کیونکہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سیاست میرا موضوع نہیں ہے۔

سپیشلائزیشن؟:

مَیں جس دوست کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا، وہاں ایک روز پہلے ایک پلمبر اس کے باتھ روم کا نلکا ٹھیک کرنے آیا تھا عید والے دن دستک پر مَیں باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ میں چھری پکڑی ہوئی تھی، مَیں سمجھا میرے دوست کے ساتھ اس کے پیسوں کے سلسلے میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہے مگر دوست نے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں آج یہ بکرا ذبح کرنے آیا ہے۔ مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ عید کے روز موچی اور ترکھان سبھی قصائی بن جاتے ہیں اس کے علاوہ سبزی فروش، پھل بیچنے والے اور عام دکاندار وغیرہ سب اپنی چھریاں تیز کرتے ہیں اور ذبح کرنے کے علاوہ پوری مہارت کے ساتھ کھال بھی اتارتے ہیں یقیناً ہر فن مولا لوگ ہیں ورنہ ہمارے ہاں تو سپیشلائزین اتنی بڑھ چکی ہے کہ دائیں اور بائیں نتھنے کے علیحدہ علیحدہ سپیشلسٹ ہیں۔

بڑی عید کا دورانیہ:

بڑی عید کے متعلق پتہ چلا کہ یہ اگلی چھوٹی عید تک چلتی ہے، بڑی عید کی ان خوشیوں کا دورانیہ بڑھانے کے لیے فریزر استعمال کیے جاتے ہیں، جن کی فروخت بقرعید کے قریب بہت بڑھ جاتی ہے۔

عجیب رسم

یہاں عید کے روز گلے ملنے کا بہت رواج ہے، مگر عجیب بات ہے کہ مرد، مردوں کے ساتھ اور عورتیں عورتوں کے ساتھ گلے ملتی ہیں۔

آسان مذہب:

عید کی نماز کے دوران سیدھی قطار بنانے پر بہت زور دیا جاتا ہے امام صاحب اس وقت تک نماز شروع نہیں کرتے جب تک صفیں سیدھی نہ ہو جائیں ہم لوگوں کو تو بس شاپ پر، سینما میں، بنک میں، غرضیکہ ہر جگہ قطار بنانا پڑتی ہے۔ اسلام واقعی آسان مذہب ہے اس میں صرف نماز کے دوران صفیں سیدھی رکھنا پڑتی ہیں۔

سلام اور سلامی:

عید سے ایک روز قبل میں ایک بیوروکریٹ کا مہمان تھا۔ میری موجودگی میں بہت سے لوگ اس بیوروکریٹ سے ملاقات کے لیے آئے ان میں سے ہر ایک نے بکرے کی رسی تھامی ہوئی تھی اور بکرے کے پیٹ پر مہندی سے "عید مبارک" لکھا نظر آتا تھا۔ مَیں سمجھا شاید یہ بکرے کو سلام کرانے کے لیے لائے ہیں کیونکہ وہ بیوروکریٹ سے اس درجہ ادب و احترام سے ملتے تھے جس طرح پاکستانی، بزرگوں سے ملتے ہیں۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ یہ بکرے سلام کے لیے نہیں، سلامی کے لیے لائے گئے ہیں۔ یہ سب مقامی رسمیں ہیں، مجھے نہ تو سلام کی سمجھ آتی ہے اور نہ سلامی کی، یقیناً یہ اچھی چیزیں ہوں گی!

تیسرا حصہ:

مجھے ایک عالم دین نے بتایا تھا کہ اسلام میں قربانی کے گوشت کے تین حصے کیے

جاتے ہیں ایک حصہ اپنے لیے، دوسرا عزیز و اقارب کے لیے اور تیسرا غربا و مساکین
کے لیے ہوتا ہے غرباء کے لیے مخصوص تیسرا حصہ عموماً اوجھڑی وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔
میرے خیال میں اس سے غریبوں کا حق تو شاید ادا ہو جاتا ہو، لیکن میرے نزدیک اس
سے سراسر بلیوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

کالوں کے خلاف تعصب:

ہمارے ہاں کی طرح پاکستان میں بھی کالوں کے خلاف تعصب پایا جاتا ہے اور
لوگ اس کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لوگوں کے غصے کا اندازہ
اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ان پر کوئی مصیبت آن پڑے تو وہ اس کا غصہ کالے
بکرے پر اتارتے ہیں۔ چنانچہ اسے ذبح کر کے اس کا گوشت چیلوں اور کوؤں
وغیرہ کو ڈال دیتے ہیں، اسے یہاں صدقہ دینا کہا جاتا ہے، گلیوں بازاروں اور کئی
پرہجوم چوکوں میں اکثر کسی کالے بکرے کی سری پڑی ہوتی ہے اور لوگ اس سے دو قدم
پرے ہو کر چلتے ہیں، سنا ہے ان پر ٹونا وغیرہ کیا گیا ہوتا ہے، اسی طرح اگر کوئی کالی بلی
کسی کا راستہ کاٹ جائے تو وہ شخص اس روز اپنا سفر ملتوی کر دیتا ہے۔ میں نے ایک
زیرو میٹر بی ایم ڈبلیو کار دیکھی جس کے بمپر کے ساتھ ایک پھٹی پرانی کالے رنگ کے
کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس خوبصورت کار کے ساتھ یہ
بدصورت چیز کار کو نظر لگنے سے بچانے کے لیے باندھی گئی ہے۔ کئی مائیں اپنے بچوں
کے ماتھے پر سرمے سے ایک کالا نقطہ سا ڈال دیتی ہیں، سنا ہے یہ بھی نظر لگنے سے
بچانے کے لیے ہوتا ہے، مگر کئی دفعہ بچے کے اپنے رنگ کی وجہ سے یہ سیاہ نقطہ نظر نہیں
آتا۔ کالے رنگ کے حوالے سے ناپسندیدگی کا دائرہ اس حد تک وسیع ہے کہ لاہور کے
ایک نواحی شہر میں قائم ایک انڈسٹری کی وجہ سے اردگرد کے علاقوں میں کیمیکل کی بو

پھیلی ہوتی ہے، جس کا لوگوں کو بہت غصہ ہے۔ چنانچہ غصے کے اظہار کے طور پر اس
شہر کا نام ''کالا شاہ کاکو'' رکھ دیا گیا ہے ''کالا شاہ کاکو'' کا مطلب ہوتا ہے ''بہت ہی
کالا'' اور ''کاکو'' اس سیاہی میں مزید اضافے کے لیے لگایا گیا ہے۔ کالوں کے خلاف
نفرت کا الزام ہم گوروں پر لگایا جاتا ہے جو صحیح ہے۔ لیکن پاکستان آ کر اندازہ ہوا کہ ہم
تو پاکستانیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہاں تو اگر کوئی سید کالا نظر آئے تو
اسے سید ماننے سے ہی انکار کر دیا جاتا ہے، حالانکہ عام حالات میں سیدوں کی بہت
عزت کی جاتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں سید کا لفظ
''جناب'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور پاکستان، ہندوستان میں پرافٹ محمدؐ کی
اولاد کو سید کہا جاتا ہے!

زیادتی کی بات:

پاکستانیوں نے کالوں کے خلاف اپنی پسندیدگی کے اظہار کے بہت سے طریقے
ایجاد کیے ہیں مثلاً ان کا مذاق اڑانے کے لیے انہیں ''بٹ صاحب'' کہنا شروع کر
دیں گے (بٹ کشمیریوں کی ایک ذات ہے اور یہ لوگ بہت گورے ہوتے ہیں) یا کسی
کالے کو اس کے اصل نام سے پکارنے کی بجائے اس کا نام ہی ''کالا'' رکھ دیں گے
اور پھر اسے اس نام سے پکارنے لگیں گے۔ حالانکہ ہم لوگ نیگروز کو ان کی پیٹھ پیچھے
نفرت سے ''نیگر'' کہتے ہیں، اگر ان کے سامنے کہیں تو کبھی نہ ختم ہونے والے نسلی
فسادات شروع ہو جائیں جبکہ یہاں بیشتر صورتوں میں یہ نام قبول کر لیا جاتا ہے بلکہ
اگر اس طرح کے شخص کو کبھی کوئی بھول چوک سے اس کے اصلی نام سے پکار بیٹھے تو
اسے پوچھنا پڑتا ہے کہ ''بھائی صاحب آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' یہ بہت زیادتی کی
بات ہے!

ہنسنے کے بہانے:

لفظ ''زیادتی'' سے یاد آیا کہ پاکستانی اخبارات میں بوجہ مشرقی شرم وحیا ''زیادتی'' کا لفظ ''ریپ'' کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ اب عام گفتگوؤں کے دوران شرفا یہ لفظ استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں، اگر کوئی غلطی سے یہ لفظ استعمال کر بیٹھے تو لوگ اس پر ہنسنے لگتے ہیں اور پوچھتے ہیں کتنے لوگ تھے؟ شاید یہاں لوگ ہنسنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

نظر لگنا:

مَیں نے ابھی بتایا تھا کہ پاکستانی لوگ نظر سے بچنے کے لیے کالے رنگ کا استعمال کرتے ہیں، مَیں مقامی دوستوں کے بہت سمجھانے کے باوجود نظر لگنے کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ خدا جانے یہ کیا چیز ہوتی ہے، تاہم مجھے اس ضمن میں کچھ ہلکا سا اندازہ ہوا ہے، چنانچہ مجھے شبہ ہے کہ شاید نظر سے بچنے ہی کے لیے ہماری گوریاں کالوں کو ساتھ لیے پھرتی ہیں۔

صحبت کا اثر:

جیسا کہ مَیں نے پہلے بتایا کہ مجھے پاکستان میں ایک بقر عید گزارنے کا موقع ملا۔ ان تین دنوں میں میری ملاقات لوگوں سے زیادہ بکروں سے ہوئی۔ جدھر نظر اٹھتی تھی بکرے ہی بکرے دکھائی دیتے تھے، بکروں میں رہتے رہتے ان کے مالکوں کی شکلیں بھی بکروں جیسی ہوگئی تھیں۔ میرے ایک دوست نے تو بے خیالی میں بکروں کو ٹٹولتے ان کے ایک مالک کو بھی ٹٹول ڈالا۔ جس پر اس نے بکروں کی ''بے'' کی آواز نکالی۔ مجھے تو کم از کم یہی محسوس ہوا، ممکن ہے اس شخص نے کچھ اور کہا ہو۔ میرے خیال

میں انسانوں کو زیادہ وقت انسانوں کے ساتھ گزارنا چاہیے۔ صحبت انسان کی شخصیت تبدیل کر دیتی ہے۔

کمیونسٹ دوست:

مجھے ان تین دنوں میں تین لفظ بہت سننے کو ملے، دوندا، چوگا، اور کھیرا۔ دوندا، دو دانت والے اور چوگا چار دانت والے بکرے کو کہتے ہیں اور انہی کی قربانی جائز ہے۔ کھیرا ایک طرح سے نابالغ جانور کو کہا جاتا ہے اور اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔ بکر منڈی میں ایک موٹے پیٹ والا شخص جو لینڈ کروزر پر آیا تھا اور جس کے ساتھ چار گن مین تھے۔ قربانی کے لیے دوندے اور چوگے چھانٹ کر الگ کر رہا تھا۔ اس نے دس بارہ بکرے خریدے، میرے دوست نے اس موٹے پیٹ والے شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ خود بھی چوگا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب ذبح ہونے والے بکروں کو حکم ہوگا کہ وہ ان موٹے پیٹ والوں میں سے جو دوندے اور چوگے ہیں ان کی قربانی کریں'' میرا خیال ہے میرا یہ مقامی دوست کمیونسٹ ہے!

محروم شخص:

میرے اسی دوست نے بتایا کہ جس جانور کا سینگ ٹوٹا ہو، ٹانگ میں خرابی ہو یا آنکھ میں نقص ہو اسلام میں اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔ میرے اس دوست نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ حکومتوں کو بھی یہ اصول مدنظر رکھنا چاہیے لیکن وہ الٹا محروم طبقے ہی کو قربانی کا بکرا بناتی ہیں اور صحت منداور تگڑے ''جانوروں'' کی طاقت میں ہر آنے والی حکومت حیلے بہانوں سے اضافہ ہی کرتی ہے۔ مجھے پتہ چلا کہ کمیونسٹ خیالات کا حامل یہ محروم شخص خود بھی اس طاقت ور طبقے میں داخل ہونے کے لیے ایک عرصے سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

بے زبان مخلوق:

پاکستان میں عید پر اخبارات خصوصی ایڈیشن شائع کرتے ہیں، جن کے سرورق پر خانہ کعبہ کی تصویر ہوتی ہے اور اندر صفحات پر فلمی ہیروئنوں کی تصویریں بکروں کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر نے بکروں کو گلے لگایا ہوتا ہے، بکرے بڑے خوش نظر آتے ہیں، شاید انہیں علم نہیں ہوتا کہ جس نے اسے گلے لگایا ہوا ہے اس نے اگلے روز اسے ذبح بھی کرنا ہے۔ مَیں نے سنا ہے کہ فلمی ہیروئنیں یہ سلوک صرف بکروں کے ساتھ نہیں انسانوں کے ساتھ بھی کرتی ہیں اور سارا سال کرتی ہیں۔ انہی صفحات میں فلمی ہیرو بھی بکروں کے ساتھ نظر آتے ہیں، مجھے یہ حق تو نہیں پہنچتا کہ مَیں پاکستان کے بعض مقبول فلمی ہیروؤں کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کروں، تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ انہیں بکروں کے ساتھ تصویر نہیں اتروانا چاہیے۔ بکرے بیچارے تو بے زبان ہوتے ہیں۔ وہ تو منع بھی نہیں کر سکتے۔

وفاداران:

مَیں نے سنا ہے کہ عید پر امیر لوگ کسی دوسرے امیر شخص کو پاؤ ڈیڑھ پاؤ گوشت بھیجنے کی بجائے بکرے کی پوری ران بھیجتے ہیں۔ میرے مقامی دوست نے بتایا کہ یہ ران گھوم پھر کر واپسی پر اس شخص کے پاس پہنچ جاتی ہے جس نے ابتدا میں یہ ران ارسال کی تھی۔ پالتو کبوتروں کے بارے میں تو مجھے علم تھا کہ وہ سارا دن فضا میں پرواز کرنے کے بعد شام کو واپس اپنی منڈیر پر آ بیٹھتے ہیں۔ لیکن کسی مرحوم بکرے کی ران میں وفاداری کا یہ عنصر میرے لیے حیران کن ہے۔

بکرے اور عوام:

مجھے یہاں ایک بات اچھی نہیں لگی، اور وہ یہ کہ جو لوگ بکرا خریدنے جاتے ہیں وہ بڑی بے دردی سے بکرے کا منہ کھول کا اس کا دوندا یا چوگا ہونا چیک کرتے ہیں یہ بکرے مسلسل تین دن تک دن میں بیسیوں مرتبہ اس نہایت تکلیف دہ مرحلے سے گزرتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جس بکرے کے منہ میں دانت ہیں وہ اپنے ساتھ اس نوع کی زیادتی کرنے والے شخص کے خلاف اپنے یہ دانت استعمال کیوں نہیں کرتا؟ اس کی وجہ تو خدا جانے کیا ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ اس طرح کی زیادتی ہوتی انہی کے ساتھ ہے جو منہ میں دانت رکھتے ہوئے بھی ان دانتوں کا استعمال نہ کریں۔ میرے ایک مقامی طنز نگار دوست نے کہا تم بکروں اور ان کے دانتوں کی بات کرتے ہو۔ ہمارے عوام تو ان بکروں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ وہ ہر طرح کا ظلم سہتے ہیں یا ظلم ہوتے دیکھتے ہیں۔ لیکن منہ میں زبان ہوتے ہوئے بھی وہ ان مظالم کے خلاف زبان نہیں کھولتے!

بکرے کی ماں:

کئی لوگ عید پر بکرا نہیں خریدتے بلکہ وہ سال دو سال اسے پالتے ہیں اور پھر عید پر اس کی قربانی دیتے ہیں۔ اس دوران بچے اسے چہل قدمی کے لیے باہر لے جاتے ہیں اور کئی شرارتی بچے اس معصوم سے جانور کو ٹکریں مارنا بھی سکھاتے ہیں جس سے وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے عید کے تیسرے دن میں ایک گھر میں مہمان تھا جہاں اس طرح کے سدھائے ہوئے بکرے کی قربانی ہونا تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک ہٹا کٹا قصائی ہاتھ میں تیز دھار چھری پکڑے فاتحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ اس میں یہ غرور اس لیے آیا تھا کہ وہ کئی برسوں سے کتنے ہی بکرے بغیر کسی مزاحمت کا سامنا

کیے ذبح کرتا چلا آ رہا تھا۔ مگر جونہی وہ اس سدھائے ہوئے بکرے کی طرف بڑھا بکرا تین چار قدم الٹے پاؤں چلا اور پھر اس نے ایک بھرپور ٹکر قصائی کو ماری۔ جس پر چھری اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پتہ چلا کہ صبح سے یہ تیسرا قصائی تھا جس کے ساتھ یہ بکرا اس نوع کا سلوک کر چکا تھا چنانچہ بکرے کے مالک نے اس کی قربانی کا فیصلہ ملتوی کر دیا۔ مجھے یقین ہے اگلے سال یہ بکرا ضرور قابو آ گیا ہوگا کیونکہ یہاں ایک محاورہ رائج ہے ''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی'' ویسے بکروں کی مائیں خیر منانا چھوڑ دیں تو شاید بکروں کی جانیں بچ جائیں لیکن ممتا بڑی کمزور ہوتی ہے۔

ٹی وی پروڈیوسر سے ملاقات:

پاکستان میں ایک ٹی وی پروڈیوسر سے میری شناسائی پیدا ہوئی۔ عمر تو اس کی پچپن سال تھی لیکن پچھتر برس کا لگتا تھا۔ اس کے سر پر چھ سات بال تھے جنہیں وہ مسلسل سر پر جمانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا اور سخت گرمی میں بھی کسی کو پنکھا چلانے نہیں دیتا تھا۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا تھا مگر جب میں اس کے ساتھ ٹی وی سٹیشن گیا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس کا کمرہ خوبصورت لڑکیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور وہ اس کی ایک ایک ادا پہ قربان ہو رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ ان میں سے کچھ اس کے ڈراموں میں کام کر رہی ہیں اور باقی کام کرنے کی خواہشمند ہیں۔ ٹی وی پروڈیوسر نے دورانِ گفتگو مجھے مخاطب کر کے کہا ''ٹی وی پر کام بہت زیادہ ہے اور تنخواہ بہت کم ہے'، مَیں یہ سن کر بہت حیران ہوا کہ اس شخص کو اس کام کی تنخواہ بھی ملتی ہے؟

بے حیائی:

ایک بزرگ مجھ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے، ان کا چہرہ بہت روشن تھا وہ

اپنی داڑھی، وضع قطع اور روشن چہرے سے مجھے یسوع مسیح کی شبیہ کی طرح لگے، مَیں انہیں دلی احترام سے ملا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ''سنا ہے آپ کے ملک میں بے حیائی بہت ہے؟'' مَیں ان کا سوال نہ سمجھ سکا، وہ میری مشکل بھانپ گئے، انہوں نے ''بے حیائی'' کے لفظ کی تشریح کرنے کی کوشش کی بالآخر مَیں سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ ہمارے ہاں پائی جانے والی عریانیت کی طرف ہے، مگر عریانیت تو عریانیت ہے۔ یہ ''بے حیائی'' تو نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ''بے حیائی'' وقت پر نہ پہنچنا، وعدہ پورا نہ کرنا، جھوٹ بولنا، اپنے کام سے بددیانتی کرنا وغیرہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں بے حیائی کا مطلب صرف کم لباسی ہے، غالباً باقی سارے کام ''حیا'' کے دائرے میں آتے ہوں گے۔ یہ حیا کا لفظ مَیں نے بار بار کوما میں اس لیے لکھا ہے کہ ''غیرت'' کی طرح یہ لفظ بھی ہماری ڈکشنری میں نہیں ہے چنانچہ مَیں نے اس کے معنی پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ''حیا'' کا لفظ اپنی ڈائری میں اردو ہی میں لکھا!

نفسیاتی مسئلہ:

اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھ سے تقریباً ہر شخص یہ سوال کرتا تھا اور میرے مختصر جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ہر شخص میری زبان سے اس کی تفصیل سننا چاہتا تھا، مَیں نے ابھی جن بزرگ کا ذکر کیا ہے وہ بھی مجھ سے اس کی تفصیل سننے کے لیے بے قرار تھے، مَیں نے ایک دوست سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے ہنستے ہوئے کہا ''کوئی خاص وجہ نہیں یہ سب ٹھرکی لوگ ہیں۔ صرف چسکے لینا چاہتے ہیں''۔

مجھے لفظ ٹھرکی کی سمجھ نہ آئی میرے دوست نے اس کا ترجمہ DIRTY OLD MAN کیا جو ہمارے ہاں انہی معنوں میں رائج ہے۔ تاہم میری تسلی نہیں ہوئی، کیونکہ اس

نوع کی گفتگو سے چسکے لینے والوں میں بوڑھے ہی نہیں جوان لڑکے بھی شامل تھے۔
یقیناً یہ قوم اس سلسلے میں کسی نفسیاتی مسئلے کا شکار ہے!

درویش صفت سائنسدان:

مجھے پاکستان میں ایک چیز نے بہت متاثر کیا اور وہ یہ کہ ہماری لیبارٹریاں کھربوں ڈالر کی لاگت سے گزشتہ برس ہا برس سے ریسرچ کر رہی ہیں مگر ابھی تک کینسر، شوگر، بلڈ پریشر، ایڈز اور اس نوع کی دوسری موذی بیماریوں کا کوئی مستقل علاج دریافت نہیں کر سکیں۔ جبکہ پاکستان میں ان تمام بیماریوں کا جڑ سے خاتمہ کرنے کی ادویات ایجاد کی جا چکی ہیں اور یہاں مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ جس کا ثبوت اخبارات میں شائع ہونے والے بڑے بڑے اشتہارات ہیں ان اشتہارات کی اشاعت سے مالکان اخبار کا دال دلیہ تو ہو جاتا ہے مگر استعمال کرنے والے ہی بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ ان ادویات کے موجد سائنسدان بڑے درویش صفت لوگ ہیں اور انہیں دولت کی کوئی طمع نہیں ہے ورنہ اگر یہ کسی ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنی سے بات کریں تو دنوں میں کھرب پتی ہو جائیں مگر ان میں سے بعض تو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کینسر اور ایڈز کی جڑ مارنے والی دوائیں چند ٹکوں میں فروخت کرتے ہیں۔

منکسر المزاج سکالر:

پاکستان میں صرف درویش صفت سائنسدان ہی نہیں نہایت بے نیاز اور منکسر المزاج سکالر بھی موجود ہیں۔ ڈارون، ہیگل، مارکس، فرائڈ، نیوٹن، آئن سٹائن اور دوسرے مغربی مفکرین نے برس ہا برس کے غور و فکر کے بعد ہزار ہا صفحات میں اپنی تھیوریاں بیان کی ہیں لیکن یہاں ان مفکرین کے اٹھائے ہوئے سوالوں کا مسکت جواب ایک دو جملوں میں دینے والے لوگ موجود ہیں جس پر مجمع عش عش کر اٹھتا

ہے۔ یہ بات میرے ایک پاکستانی دوست نے بتائی۔ اس ضمن میں تھوڑا سا تجربہ مجھے بھی ہوا، ایک صاحب میرے پاس آئے، انہوں نے سولہ صفحے کا ایک پمفلٹ مجھے عنایت کیا (جو اردو زبان میں تھا) اور کہا ''اس میں آپ کے تمام مفکرین کے گمراہ کن فلسفوں کے جواب موجود ہیں۔ کبھی موقع ملے تو کسی سے ترجمہ کروا کر اسے پڑھیں''۔
یقیناً میں ایسا کروں گا!

شرمسار دولہا:

میں ایک دفعہ پہلے بھی پاکستان میں شادی بیاہ اور موت کی عجیب و غریب رسموں کے بارے میں بتا چکا ہوں، پاکستان کے دورے کے دوران ایک اور عجیب بات میرے مشاہدے میں آئی اور وہ یہ کہ شادی سے پہلے ہی دولہا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا بلکہ کچھ تو بعد میں بھی کسی کو منہ نہیں دکھا سکتے چنانچہ جب دولہا کی بارات روانہ ہوتی ہے تو اس کے منہ کو پھولوں کی لڑیوں سے چھپا دیا جاتا ہے۔ اسے مقامی زبان میں سہرا کہا جاتا ہے ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ منہ دکھانے کی صورت میں بارات واپس جا سکتی ہو...... اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ کئی دولہا شادی کے بعد کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے تو یہ محض ایک مقامی محاورے کا استعمال ہے، اس کا کوئی تعلق دولہے کی نصابی یا غیر نصابی سرگرمیوں یا ان کے نتائج سے نہیں ہے''۔

ناک کی حفاظت:

میرے لیے یہ امر بھی بہت حیرت انگیز تھا کہ یہاں کے دولہا جب لڑکی والوں کی طرف بارات لے کر جاتے ہیں تو دولہا نے اپنے ناک پر مسلسل رومال رکھا ہوتا ہے۔ جسے وہ بائیں ہاتھ سے تھامے رکھتا ہے میں نے ایک مقامی دوست سے اس کی وجہ پوچھی تو اس ستم ظریف نے کہا کہ دولہا کو دراصل اس وقت اپنے قریب بیٹھے ہوئے

دیرینہ دوستوں کے فاسد خیالات کی بُو آ رہی ہوتی ہے جس کا ثبوت دیسے والے دن
دولہا سے سرگوشیوں میں پوچھے جانے والے ان کے سوالوں سے ملتا ہے، جبکہ میرے
خیال میں ممکن ہے وہ اپنی ناک کی حفاظت کر رہا ہو کیونکہ مَیں نے سنا ہے کہ مقامی
لوگوں کو ذرا ذرا سی بات پہ خصوصاً شادی بیاہ کے موقع پر، ناک کٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔
واضح رہے کہ یہاں ناک کٹنا بے عزتی کے معنوں میں لیا جاتا ہے، تاہم کئی دفعہ سچ مچ
بھی کاٹ دی جاتی ہے۔

پابندیٔ وقت:

پاکستانیوں کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی اور وہ یہ کہ یہ لوگ وقت کی پابندی کا
بہت خیال رکھتے ہیں چنانچہ شادی کے دعوت ناموں پہ اگر آمدِ بارات آٹھ بجے شام
لکھا ہو تو یہ ٹھیک رات کو بارہ بجے وہاں پہنچتے ہیں کہ جانتے ہیں بارات کا اصل ٹائم
رات بارہ بجے ہی ہے۔ کچھ لوگ جو وقت کے زیادہ ہی پابند ہیں، وہ بارہ کی بجائے
رات کے ایک بجے میرج ہال آتے ہیں کیونکہ بارات کی آمد کے بعد بارہ بجے سے
لے کر ایک بجے تک دولہے کے دوستوں نے بھنگڑا ڈالنا ہوتا ہے اور بڑھکیں لگانا ہوتی
ہیں۔ مَیں نے جب پہلی بار یہ منظر دیکھا تو مَیں سمجھا کہ لڑکے والے نکاح کرنے نہیں،
لڑکی کو اٹھانے آئے ہیں تاہم بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ محض خوشی کا اظہار ہوتا ہے!

گھوڑے کی پریشانی:

دولہا جس گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، اس گھوڑے کی پریشانی قابلِ دید ہوتی ہے،
وہ بار بار بے چینی سے اپنے پاؤں زمین پر پٹکتا ہے، اس کا انداز خاصا جارحانہ ہوتا ہے
چنانچہ محتاط لوگ اس سے ایک دولتی کے فاصلے پر رہتے ہیں، اس کی وجہ اس کے علاوہ
کوئی نہیں ہوسکتی کہ یہ گھوڑا ایک عرصے سے مجرد زندگی گزار رہا ہوتا ہے، چنانچہ وہ کسی

دوسرے کے سر پہ سہرے بندھے نہیں دیکھ سکتا، اس کے ساتھ ایک زیادتی یہ بھی کی
جاتی ہے کہ اس کی آنکھوں کے دائیں بائیں کھوپے باندھ دیئے جاتے ہیں تاکہ کسی
گھوڑی پہ اس کی نظر تک نہ پڑے اور یوں وہ صراطِ مستقیم پہ چلتا رہے، سو ایک صالح
گھوڑا غیر صالح باراتیوں کو دولتیاں تو مارے گا!

غلط فہمی:

مَیں نے ایک شادی میں جب اپنے اس دوست کو دولہا کے روپ میں دیکھا جو
اس ہوٹل میں دروازہ کھولنے پہ مامور ہے جہاں پاکستان کی سیاحت کے دوران میرا
قیام تھا تو مجھے بہت خوشی ہوئی، اس نے اس روز بھی اپنے سر پہ طرے والی دستار پہنی
ہوئی تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی بہت ہینڈسم لگ رہا تھا، مَیں نے آگے بڑھ کر
اسے اس کے نام سے پکارتے ہوئے معانقہ کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ یہ وہ شخص نہیں
ہے۔ بلکہ یہ طرے والی دستار تو ان دنوں گیٹ کیپر کے علاوہ دولہے بھی پہنتے ہیں۔

دہشت گردی کی تلقین:

ایک بارات کے ساتھ پولیس بینڈ بھی تھا، وہ بہت خوبصورت دھنیں بجا رہے
تھے اور باراتی اس سے محظوظ ہو رہے تھے بلکہ خود دولہا بھی ایک سرخوشی کے عالم میں تھا،
اس دوران بینڈ والوں نے ایک اور دھن بجائی، مجھے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی مگر
اچانک دولہے نے غصے سے کہا ''بند کرو یہ دھن!'' اور اس کے ساتھ ہی باراتیوں نے
ہنسنا شروع کر دیا، مَیں نے اپنے مقامی دوست سے اس صورتِ حال کی وجہ پوچھی تو
اس نے کہا ''ابھی بینڈ والے جو دھن بجا رہے تھے اور جس پہ دولہے نے ناراضگی کا
اظہار کیا تھا، وہ ایک جنگی ترانے کی دھن تھی، جس کے بول تھے اٹھ مردِ مجاہد جاگ
ذرا، اب وقتِ شہادت ہے آیا...... اس پہ لوگ ہنس رہے تھے'' سچی بات یہ ہے کہ مجھے

اس کی سمجھ نہیں آئی کیونکہ ''مجاہد'' اور ''شہادت'' کے لفظوں کی اس طرح کھلم کھلا تکرار تو سراسر دہشت گردی کو اسپورٹ کرنا ہے حالانکہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف عالمی محاذ کا ایک فعال رکن ہے!

اسلام کی تلخیص:

پاکستان میں ماضی کی ایک بہت مشہور فلم ''سرفروش'' کا یہ ڈائیلاگ بہت مقبول ہوا ''چوری میرا پیشہ اور نماز میرا فرض ہے'' مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ صرف ایک فلمی ڈائیلاگ نہیں بلکہ یہ اس ''اسلام'' کی تلخیص ہے جو پورے عالمِ اسلام میں گزشتہ چند صدیوں سے رائج ہے۔

سنکی لوگ:

پاکستان آنے سے پہلے میں نے پاکستان کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا اس کے مطابق یہ ایک اسلامی جمہوریہ ہے چنانچہ میں نے ہر پاسپورٹ پر ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' لکھا ہوا بھی دیکھا مگر یہاں ایک مذہبی پیشوا سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا ''یہ ملک اسلامی نہیں ہے'' ایک سیاست دان نے دوران ملاقات کہا ''یہ ملک جمہوریہ نہیں ہے'' اور فٹ پاتھ پر بیٹھے ایک شخص نے تلخ لہجے میں کہا ''یہ تو وہ پاکستان ہی نہیں ہے جس کا ہم نے خواب دیکھا تھا'' اس طرح کے سنکی لوگ پاکستان میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

تیز رفتار ترقی:

قیامِ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں بھی مجھے پاکستان جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت یہ ملک بہت پسماندہ ہوتا تھا لڑائی جھگڑے کے دوران لوگ گراری والا چاقو

استعمال کرتے تھے جس کا لیور دبانے پر ''کڑکڑ'' کی آواز کے ساتھ چاقو کھل جاتا تھا اور بسا اوقات مد مقابل اس کی آواز سن کر ہی بھاگ جاتا تھا مگر اب تو لوگ جدید ترین اسلحہ استعمال کرتے ہیں میں نے بہت کم ملکوں کو اتنے کم وقت میں اتنی ترقی کرتے دیکھا ہے۔

اللہ خیر کرے:

پاکستانی قوم عمومی طور پر بہت محبِ وطن ہے تاہم بہت سے لوگ خصوصاً دانشور طبقہ مجھے حب الوطنی سے عاری لگتا ہے مثلاً جب میں پاکستان میں تھا اور ایک روز ایک ریستوران میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ ٹی وی پر اچانک قومی نغمے چلنا شروع ہو گئے جس پر میرے پہلو میں بیٹھا ایک دانشور قسم کا شخص پریشان ہو گیا۔ اس کے بعد قومی ترانہ سنائی دیا اور پھر خاکی وردی میں ملبوس ایک شخص ٹی وی پر آیا اس نے کہا ''میرے عزیز ہم وطنو'' اس پر دانشور قسم کے شخص کے منہ سے بے ساختہ ''اللہ خیر کرے'' کے الفاظ نکلے حالانکہ ایک محبِ وطن کے طور پر اسے قومی نغمے اور قومی ترانہ سن کر خوش ہونا چاہیے تھا۔

ایک وکھری ٹائپ کا محبِ وطن:

پاکستان میں میری ملاقات ایک خاص قسم کے محبِ وطن سے بھی ہوئی میں نے اسے اس ضمن میں بلند بانگ دعوے کرتے دیکھا تو پوچھا ''اگر تمہارے پاس دو فیکٹریاں ہوں تو کیا تم یہ قوم کے نام وقف کر دو گے۔'' وہ بولا ''بے شک یہی کروں گا'' میں نے کہا ''اگر تمہارے پاس دو کوٹھیاں اور دو کاریں ہوں تو'' کہنے لگا ''ایک کوٹھی اور ایک کار قوم کے نام وقف کر دوں گا''۔ میں نے پوچھا ''اگر تمہارے پاس دو بھینسیں ہوں تو کیا کرو گے؟'' بولا دونوں بھینسیں اپنے پاس رکھوں گا'' میں نے سوال

کیا ''وہ کیوں؟'' اس نے کہا ''اس لیے کہ میرے پاس دو بھینسیں موجود ہیں''۔ پاکستان میں حب الوطنی کی یہ قسم بہت عام ہے۔

حق بہ حقدار؟:

میں ایک دفعہ پہلے بھی مشاعرے کے بارے میں اپنے قارئین کو بتا چکا ہوں کہ پاکستان اور ہندوستان میں Poetry reciting کی بہت بڑی بڑی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ ان محفلوں کو ''مشاعرہ'' کہا جاتا ہے۔ یہاں شاعر اپنا کلام سناتا ہے اور سامعین واہ واہ کرتے ہیں۔ ایک پاکستانی دوست مجھے ایک مشاعرے میں لے گیا اور یہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ جب ایک شاعر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا تو لوگ اس کو داد دینے کی بجائے اسٹیج پر اس کے پیچھے بیٹھے ایک اور شاعر کو جس کا نام سرتاج تھا ''واہ سرتاج صاحب واہ'' کہہ کر داد دیتے رہے۔ میں نے دوست سے وجہ پوچھی تو وہ ''حق بہ حقدار رسد؟'' کہہ کر خاموش ہو گیا مجھے اس جملے کا مطلب کسی سے پوچھنا پڑے گا۔

شرارتی سامعین:

ایک اور مشاعرے میں ایک صاحب اپنا کلام سنانے آئے۔ ان کا نام حیات تھا۔ جب انہوں نے پہلا شعر پڑھا تو سامعین نے داد دیتے ہوئے کہا۔ ''واہ حیات واہ'' مگر وہ شاعر صاحب تیسرے چوتھے شعر پر ہی ناراض ہو کر مشاعرے سے واک آؤٹ کر گئے۔ میں نے اپنے دوست سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ لوگ دراصل ''واہ حیات'' کے پردے میں شاعر کو ''واہیات'' کہہ رہے تھے مجھے بہت ہنسی آئی کیونکہ ہمارے ہاں انگریزی میں لفظ واہیات تقریباً Alinoxious کے ہم معنی ہے۔

روٹی کی ایک لذیذ قسم:

ہمارے ہاں مغرب میں مکئی کی روٹی Bread ہوتی ہے۔ گندم کی روٹی ہوتی

ہے، بیسن کی روٹی ہوتی ہے، چھان بورے کی روٹی ہوتی ہے لیکن پاکستان میں جس روٹی کا ذکر بہت عام ہے وہ ''عزت کی روٹی'' ہے، تاہم میں صرف اس کا ذکر ہی سنتا رہا کسی کو کھاتے نہیں دیکھا میں ایک دفعہ لاہور کے بازارِ حسن مجرا دیکھنے گیا جو طوائف مجرا کر رہی تھی وہ بہت خوبصورت تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا تم فلموں میں کام کیوں نہیں کرتیں؟ اس نے جواب دیا مجھے فلموں میں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ یہیں عزت کی روٹی دے رہا ہے''۔ اس پر مجھے ایک بار پھر تجسس ہوا کہ یہ عزت کی روٹی کیا چیز ہے؟ بہر حال پاکستان میں قیام کے دوران میں نے عزت کی روٹی کا ذکر رشوت خوروں، ہیروئن فروشوں، بردہ فروشوں اور ضمیر فروشوں سب کی زبان سے بار بار سنا یقیناً یہ کوئی بہت لذیذ چیز ہوگی تبھی تو سارے طبقے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

بکر منڈی:

بکر منڈی اس مارکیٹ کو کہتے ہیں جہاں بکرے فروخت ہوتے ہیں۔ میں ایک دفعہ اپنے ایک دوست کے ساتھ وہاں گیا تھا، اس نے کوئی بکرا خریدنا تھا، بیچارے بکروں کے مالک تو دبک کر پرے کھڑے تھے جبکہ خود ساختہ دلالوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال لیا، یہ دلال صبح سے شام تک یہیں رہتے ہیں۔ ان کی شکلیں اور آوازیں بھی بکروں جیسی ہو گئی ہیں۔ بعض دفعہ تو اتنا مغالطہ ہوتا ہے کہ گاہک کسی دلال کو بکرا سمجھ کر اس کے دانت چیک کرنے لگتا ہے۔

مستعد پولیس:

میں جن دنوں پاکستان گیا، وہاں دہشت گردی زوروں پر تھی مگر خوش آئندہ بات یہ تھی کہ پولیس پوری طرح چوکس نظر آئی۔ البتہ ان کا مجرموں کی تلاش کا انداز بہت انوکھا تھا۔ وہ مشکوک افراد کا صرف منہ سونگھتے تھے یا ڈکی کی تلاشی کے دوران اگر انہیں

کوئی بوتل وغیرہ نظر آتی تو اسے قبضے میں لے کر مجرم کو تھانے اور بوتل گھر لے جاتے تھے۔ اسی طرح اگر کسی گاڑی یا رکشے میں عورت اور مرد سوار ہوتے تو ان سے نکاح نامہ طلب کرتے تھے۔ پولیس کی اتنی مستعدی کے باوجود دہشت گرد ملک بھر میں دندناتے رہے۔ اللہ جانے اس کی کیا وجہ تھی؟

جنگی ساز وسامان؟

پاکستان کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ اس کے پاس جنگی ساز وسامان اس قدر وافر تعداد میں ہے کہ شاید کسی مغربی ملک کے پاس بھی نہ ہو۔ دراصل مجھے ایک لاہوریئے نے بتایا تھا کہ پاکستان کے پاس لاکھوں کی تعداد میں جہاز ہیں۔ جن میں سے دس بارہ لاکھ جہاز تو صرف لاہور میں موجود ہیں، وہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہاں ''جہاز'' ہیروئن کے عادی افراد کو کہا جاتا ہے کیونکہ جب انہوں نے بیٹھنا ہوتا ہے تو وہ بالکل جہاز کی طرح تھوڑا تھوڑا نیچے آتے ہیں اور بالآخر کامیاب لینڈنگ کرتے ہیں۔

خداداد صلاحیت:

پاکستان نے میڈیکل سائنس میں بہت ترقی کی ہے چنانچہ یہاں ایڈز، کینسر، کڈنی فیلیر، شوگر، بلڈ پریشر اور ان دیگر تمام امراض کا تشفی بخش اور مستقل بنیادوں پر علاج کا دعویٰ کیا جاتا ہے جن کا علاج مغرب کے پاس بھی نہیں ہے۔ ان امراض کے پاکستانی معالجوں کے پاس کسی میڈیکل کالج کی کوئی ڈگری نہیں ہے۔ اہل مغرب اس خداداد صلاحیت سے محروم ہیں، اس میں وہاں کی حکومتوں کا بھی قصور ہے جو ایسی خداداد صلاحیت رکھنے کو جیل بھجوا دیتے ہیں۔

خوش طبعی:

لاہوریئے بہت خوش طبع لوگ ہیں چنانچہ یہاں ایک ایسے ہی خوش طبع شخص سے میری ملاقات ہوئی، اس نے مجھے بتایا کہ اس کی دو کمزوریاں ہیں، ایک کمزوری عورت اور دوسری مردانہ کمزوری ہے۔ عجیب مسخرا شخص تھا۔

لوٹے:

ہم اہل مغرب لوٹے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کیونکہ یہ ہمارے ہاں نہیں ہوتا جبکہ پاکستان میں یہ برتن انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اس کے بغیر کوئی ٹائلٹ مکمل نہیں سمجھا جاتا، ایک لاہوریا مجھے بتا رہا تھا کہ لوٹوں کے بغیر کوئی پارلیمنٹ بھی مکمل نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں وہ اپنی روایتی زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہا تھا ورنہ لوٹوں کا پارلیمنٹ سے کیا تعلق ہے؟

یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا:

میں نے ایک گورے چٹے اور صحت مند شخص کو دیکھا وہ گوالمنڈی میں ایک دکان کے باہر دھرے بنچوں پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا پہلے اس نے ہریسہ کھایا۔ پھر اس نے ڈبل پائے کی پلیٹ اور دو کلچوں کا آرڈر دیا، اس کے بعد کھد منگوائی اور کھد کے ساتھ دو قلچے بھی کھائے، آخر میں اس نے جمبو سائز کے ایک تانبے کے گلاس میں لسی پی جس میں اس نے چار کھوئے کے پیڑے بھی ڈلوائے تھے۔ میں نے اپنے پاکستانی دوست سے پوچھا: ''یہ کون صاحب ہیں اور کیا کام کرتے ہیں؟'' اس نے جواب دیا: ''یہ بٹ صاحب ہیں اور یہی کام کرتے ہیں جو آپ نے ابھی دیکھا ہے''۔

حاصل خوراک:

میرے مغربی دوستوں کو یقیناً الجھن ہو رہی ہوگی کہ ابھی میں نے جن اشیائے خورد و نوش کا ذکر کیا ہے ان کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ انہیں ممکن ہے پایوں اور کھد کے بارے میں بھی تجسس ہو تو ان کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ ان کی تفصیل میں جانے سے اہل مغرب اور اہل مشرق کے تعلقات کشیدہ ہو سکتے ہیں چنانچہ میں ان سب اشیائے خورد و نوش کا Net Result بیان کر سکتا ہوں اور اس کے لیے صرف ایک لفظ ''کلیسٹر ول'' کافی ہے۔

دور بینی:

پاکستان میں پاکستانی کلچر کے فروغ کیلئے بہت سے ادارے اور این جی اوز کام کر رہی ہیں اس ضمن میں مجھے جو بات بہت اچھی لگی وہ یہ تھی کہ ان اداروں کے منتظمین کا کوئی تعلق پاکستانی کلچر سے نہیں تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کلچر میں پرورش پانے والا شخص اپنے کلچر کو اتنا نہیں سمجھ سکتا جتنا دور سے نظارہ کرنے والا شخص سمجھ سکتا ہے۔

سہانے مناظر:

مجھے ایک دفعہ لاہور سے کراچی تک ٹرین میں سفر کا اتفاق ہوا۔ میں پاکستان کے سہانے مناظر دیکھنے کے لیے کھڑکی کے ساتھ چمٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ صبح کے وقت جب ٹرین کھیتوں کھلیانوں، میدانوں سے گزر رہی تھی میں نے تمام رستے میں لوگوں کو قطار اندر قطار اکڑوں بیٹھے دیکھا، ممکن ہے یہ لوگ صلاح مشورے کیلئے جمع ہوئے ہوں مگر اس کیلئے ٹرین کی طرف منہ کر کے بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟

دو بڑے کاروبار:

پاکستان میں دو کاروبار بڑے منافع بخش ہیں۔ ایک کاروبار بیوٹی پارلر اور دوسرا حکیموں کا ہے خصوصاً شادی کے دنوں میں یہ دونوں کاروبار عروج پر ہوتے ہیں۔ شادی والے روز دلہنیں بیوٹی پارلر اور دولہے، حکیموں کا رخ کرتے ہیں۔

پاکستان کے بارے میں غلط فہمی:

لاہور میں سٹیج ڈراموں کا بہت رواج ہے، ان ڈراموں میں لوگوں کو ہنسانے کے لیے اداکار ایک دوسرے کو جوتیاں مارتے ہیں اور ماں بہن کی گالیاں بھی دیتے ہیں۔ بعض دفعہ ان گالیوں کا رخ ناظرین کی طرف بھی ہو جاتا ہے جس پر ناظرین تالیاں بجا کر داد دیتے ہیں ان ڈراموں میں رقاصاؤں کے برہنہ ڈانس بھی شامل ہوتے ہیں چنانچہ میرے نزدیک ایک محدود جنونی طبقے کی وجہ سے پاکستان کو مذہبی انتہا پسند ملک قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔ اہل مغرب کو اپنی سوچ پر نظر کرنا چاہیے۔

شلوار اور دستار:

پاکستان کا قومی لباس شلوار کرتا ہے، میرے لیے اپنے مغربی دوستوں کو شلوار کے ''کوائف'' سے پوری طرح آگاہ کرنا خاصا مشکل ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ پنجاب میں جو شلوار پہنی جاتی ہے اس پر بھی اگرچہ کافی کپڑا لگتا ہے مگر سندھ، بلوچستان اور سرحد کی شلوار کا طول و عرض تقریباً برطانیہ کے رقبے کے برابر ہے پاکستان کے رورل ایریاز میں دستار کا بھی بہت رواج ہے جسے عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے چنانچہ ان علاقوں کے جاگیردار اور وڈیرے انگریز کے زمانے سے لے کر آج تک ہر دور حکومت میں اپنی دستار کی حفاظت کرتے رہے۔ شلوار کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

سالا:

ہماری انگریزی زبان میں سالے اور بہنوئی کیلئے الگ الگ الفاظ نہیں ہیں بلکہ ان دونوں کیلئے BROTHER IN LAW کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اردو زبان بہت RICH ہے اس میں بہن کے شوہر کو بہنوئی اور بیوی کے بھائی کو سالا کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے زبان کی RICHNESS کے علاوہ یہ مقامی لوگوں کی ضرورت بھی ہو کیونکہ انہوں نے اگر کسی کو گالی دینا ہو تو کبھی اسے اپنا سالا اور کبھی خود کو اس کا بہنوئی قرار دیتے ہیں۔ گالی تو ہم لوگ بھی دیتے ہیں مگر ہمارا ذہن ان رشتوں کے حوالوں سے اتنی گہرائی تک کبھی نہیں پہنچ سکا۔ اس سے مقامی لوگوں کی ذہانت اور خیالات کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مہم جو قوم:

میں نے پاکستانیوں سے زیادہ مہم جو قوم کوئی اور نہیں دیکھی، وہ اتنے RISKY کام کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً یہاں ہر گھر میں تانبے کی ایک چھوٹی بوتل ہوتی ہے جس میں لوہے کی ایک پتلی سی سلائی ہوتی ہے، بوتل کو سرمہ دانی اور سلائی کو سرمچو کہا جاتا ہے۔ بوتل میں ایک کالے رنگ کا پتھر پیس کر رکھا گیا ہوتا ہے جسے سرمہ کہتے ہیں، گھر کے تمام افراد ایک ہی سرمچو باری باری اپنی آنکھوں میں پھیرتے ہیں، انہیں یقین ہے کہ اس سے بینائی بہتر ہوتی ہے تاہم اس عمل سے بینائی ختم ہونے کا اندیشہ بھی لاحق رہتا ہے مگر دلیر قومیں ایسے چھوٹے موٹے خطروں کو خاطر میں نہیں لایا کرتیں!۔

:LIBERATED PAKISTAN

ہمارے ہاں جو لوگ برہنہ رہنا پسند کرتے ہیں ان کے لئے بعض مقامات

مخصوص کیے گئے ہیں تاہم ہمارا مغربی معاشرہ اپنی تمام تر آزاد خیالی کے باوجود اس رویے کو زیادہ پسند نہیں کرتا جبکہ پاکستان اس معاملے میں ہم سے بہت آگے ہے۔ میں نے کئی مرتبہ کسی جوان مرد کو بھری سڑکوں پر برہنہ پھرتے دیکھا یہاں کا معاشرہ نہ صرف یہ کہ انہیں برداشت کرتا ہے بلکہ ایسے Liberated لوگوں کی یہاں بہت عزت کی جاتی ہے لوگ ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی نظر کرم کو ترستے ہیں آپ سڑکوں پر برہنہ پھرنے والے ان روشن خیال لوگوں کے مقام اور مرتبے کا اندازہ اس سے لگائیں کہ یہاں انہیں "اللہ لوک" کہا جاتا ہے "اللہ لوک" ہمارے ہاں سینٹ (Saint) کو کہتے ہیں، تاہم عورتوں میں اس روشن خیالی کا فقدان ہے کیونکہ میں نے کسی سڑک پر کوئی اللہ لوک عورت نہیں دیکھی۔

ملکی سیاح کا بین الاقوامی طرزِ احساس

عطاء الحق قاسمی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف ادب اور صحافت کے درمیان صدیوں سے حائل آہنی دیوار بہ یک قلم پیوندِ خاک کر دیا بلکہ انہوں نے کالم جیسی بظاہر گری پڑی صنفِ سخن کی اس انداز سے دست گیری کی کہ اردو ادب و صحافت کا یہ مشترکہ اور نابالغ فرزند تمام معتبر اصناف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرنے لگا۔ دونوں لفظی خانوادے اسے سر آنکھوں پہ بٹھانے کو تیار ہو گئے۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی:

ع چراغ ایک ہے اور دو گھروں میں جلتا ہے

کالم نگاری میں عطاء الحق قاسمی کی ایک تخصیص یہ بھی ہے کہ انہوں نے نہ صرف اردو کالم کو صحافت کی وادیِ پُر خار سے گلستانِ ادب کا راستہ سُجھایا بلکہ پُر تکلف ایوانوں میں جی حضوریاں کرتے اس کالم کو زندگی سے بھرپور چوراہے میں لا بٹھایا۔

ابن انشا کی مانند عطاء الحق قاسمی کی انفرادیت بھی یہی ہے کہ وہ صحافی بعد میں اور ادیب و مزاح نگار پہلے ہیں۔ طنز و مزاح میں بھی ان کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ وہ محض اس کے روایتی حربوں اور ہتھکنڈوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر گھڑی اس میدان میں امکانات کے نئے در وا کرنے اور ہر پل نئے طریقۂ واردات کی تلاش میں جستجو کے گھوڑے پہ سوار نظر آتے ہیں۔

ایک بڑے مزاح نگار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ چشمِ تصور یا روزنِ خیال ہی سے ایسے عالم کی جھلک ملاحظہ کر لیتا ہے جو عام آدمی کیلئے ان دیکھی اور ان جانی ہی نہیں حیران کن بھی ہوتی ہے۔ مزاح نگار کی یہ فنکاری ادب میں عجب معجزے دکھاتی ہے۔ کہیں وہ تخیل

کے زور سے ماضی کو حال میں کھینچ لاتا ہے، کبھی کرشمۂ وجدان سے حال میں استقبال کی دنیا آباد کر لیتا ہے، اور کبھی کبھی تو اسی قوتِ خیال کے سہارے ماضی اور مستقبل دونوں کی لگامیں کھینچ کر انہیں حال کے ہوم گراؤنڈ پر کھیلنے اور کھل کھیلنے کا موقع فراہم کر دیتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے زیرِ نظر تصنیف میں طنز و مزاح کا ایسا ہی منفرد چراغ روشن کیا ہے اور اپنے اس طلسمی چراغ کی مٹھی بھر روشنی میں اپنے قارئین کو ایک ممکن دنیا کی ناممکن انداز سے سیر کرائی ہے۔ کسی بھی تہذیب و ثقافت کو اپنی نظر سے دیکھ کر اس کی اچھی یا بری تصویر کشی کا چلن تو ہمارے ہاں عام ہے لیکن اپنے مقامی تمدن کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کا سلیقہ عطاء الحق قاسمی کی اپنی ایجاد ہے۔ کوئی بھی جدت اگر اپنا اخلاقی، ادبی یا شرعی جواز پیش نہ کر سکے، وہ بدعت کے درجے پر متمکن ہو جاتی ہے لیکن عطاء الحق قاسمی کی یہ جدت اپنے پاؤں پہ چلتی ہوئی آتی ہے اور قارئینِ ادب کو نہ صرف حیرت، و اشتیاق کے لطف سے آشنا کرتی ہے بلکہ نہال ہوتے قاری کے تجسس کو مہمیز کرتی ہوئی گزرتی ہے اور وہ اسی دنیا میں اپنے من پسند مناظر دیکھنے کیلئے بے چین نظر آنے لگتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عطاء الحق قاسمی کو یہ سلیقہ ان کے بیرونِ ملک اسفار و قیام نے عطا کیا ہے۔

لاہور...... ظاہر ہے ایک شہر، ضلع یا صوبائی دارالحکومت ہی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک علمی و ادبی دبستان، تہذیبی و ثقافتی مرکز اور سیاسی و تاریخی منبع ہے، جس پہ مختلف اہلِ قلم نے اپنے اپنے انداز میں نظر ڈالی ہے۔ کنہیا لعل نے اس کی تاریخی حیثیت اجاگر کی تھی، پطرس بخاری نے اس کا شریر جغرافیہ نذرِ قارئین کیا تھا جبکہ عطاء الحق قاسمی نے اسے فینٹیسی کا روپ عطا کر دیا ہے۔

فینٹیسی اردو ادب کی وہ نایاب اور کم یاب صنفِ سخن ہے، جس کا آغاز تو ملا وجہی کی معروف تمثیل "سب رس" کے ساتھ ہی ہو گیا تھا لیکن جولانیِ تخیل کے فقدان کے

سبب اس طرف بہت کم اہلِ قلم نے توجہ کی۔ اسے زیادہ شہرت معروف انشا پرداز محمد حسین آزاد کے مشہور زمانہ مضمون ’’شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار‘‘ اور فرحت اللہ بیگ کے ’’دلی کا ایک یادگار مشاعرہ‘‘ کے ذریعے حاصل ہوئی۔ کتابی صورت میں اس کا ڈول نسیم حجازی (۱۹۱۴ء-۱۹۹۶ء) نے ۱۹۴۷ء میں ’’سوسال بعد‘‘ کے ذریعے ڈالا۔ بعد ازاں محمد خالد اختر (۱۹۲۰ء-۲۰۰۲ء) کی ’’بیس سو گیارہ‘‘ (اوّل: ۱۹۵۰ء) نے بھی قارئین کے خاص حلقے سے دادِ طنز وصول کی۔

طنز و مزاح کی فطری صلاحیتوں کی بنا پر عطاء الحق قاسمی کا قلم اس صنف میں خوب رواں ہوتا ہے۔ کبھی وہ خود کو مرحوم ثابت کر کے اپنا خاکہ اڑاتے ہیں، کہیں طنز انگیز شگفتگی سے لبریز فرضی وصیت نامے تحریر کرتے ہیں اور کہیں ایک غیر ملکی سیاح کی زبان سے اپنے معاشرے کے بندھے ٹکے رسوم و رواج اور فرسودہ روایات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام ادبا کی فینٹیسیز ماضی اور مستقبل کو حال میں کھینچ لانے کے عمل سے وجود میں آئی تھیں، عطاء الحق قاسمی نے اپنے اچھوتے وصیت ناموں اور انوکھے سفرنامے کے ذریعے اس صنف میں امکانات کے نئے در وا کیے ہیں۔

ہمارا سب سے بڑا تہذیبی المیہ یہ ہے کہ سماجی برائیوں کے تمام تنکے ہماری آنکھوں کا شہتیر بن چکے ہیں۔ خوشی و غمی کے مواقع پہ رائج ہو جانے والی لایعنی روایات کو ہم مقدس گائے سمجھ کے پوجے جا رہے ہیں۔ شعوری جانچ پرکھ اور تنقیدی بصیرت، ہماری ارضی جہالت اور ازلی بھیڑ چال کے حق میں مکمل طور پر دست بردار ہو چکی ہیں۔ بقول ڈاکٹر خورشید رضوی:

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی   وہی زاویے کہ جو عام تھے مجھے کھا گئے

ہم وطنوں کی اس اجتماعی جہالت پر ہر حساس فنکار کی طرح ہمارے مزاح نگار کا دل بھی خون کے آنسو روتا ہے لیکن وہ کسی واعظِ خشک کی مانند ان کو صلواتیں سنانے یا

جہنم کا ایندھن بننے کی ’’خوشخبری‘‘ سنانے نہیں بیٹھ جاتے بلکہ ان کا احساس بیدار کرنے کیلئے فنکارانہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ وہ بعض نازک آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کے احساس کے پیشِ نظر طنز کے تیر برسانے کیلئے ایک غیر ملکی کا کندھا استعمال کرتے ہیں اور نامعقول رسوم کا مضحکہ اڑانے کیلئے زبانِ غیر سے شرحِ آرزو کرتے ہیں۔ اسی اخلاقی احتیاط اور فنکارانہ احساس نے اس تصنیف کو لطیف مزاح اور بلیغ طنز سے بھر دیا ہے۔ ہم اپنے مؤقف کی وضاحت چند مثالوں سے کرتے ہیں۔

(۱) ’’پاکستان میں شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کا راضی ہونا کافی نہیں، بلکہ ان کے والدین کا راضی ہونا ضروری ہے، تاہم وہ اس سلسلے میں اولاد کی مرضی ضرور دریافت کرتے ہیں۔ اگر لڑکا لڑکی ’’ہاں‘‘ کر دیں تو یہ شادی ہو جاتی ہے اور اگر ’’نہ‘‘ کہیں...... تو بھی ہو جاتی ہے‘‘۔

(۲) ’’میرے لیے دیہات میں جانا ممکن نہ تھا، اس لیے ایک پاکستانی شناسا کے مشورے پر میں ایک پنجابی فلم دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ یہ فیصلہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ فلمیں کسی ملک یا علاقے کی تہذیب کا صحیح عکاس ہوتی ہیں۔ فلم کے دوران مجھے ایک بار پھر اس امر پر بے پایاں خوشی ہوئی کہ پنجاب کے دیہات معاشی لحاظ سے نہ صرف یہ کہ پسماندہ نہیں ہیں بلکہ تہذیبی لحاظ سے انہیں پنجاب کے شہروں پر بھی برتری حاصل ہے۔ معاشی لحاظ سے دیہی معاشرہ مجھے یوں خوشحال محسوس ہوا کہ فلم میں مزارعین کی بیٹیوں کو زرق برق لباس اور قیمتی میک اپ سے آراستہ حالت میں گھر کے کام کاج کرتے دکھایا گیا تھا اور ان کے ماڈرن ہونے نیز تمام TABOOS وغیرہ سے آزاد ہونے کا ثبوت اس امر سے ملتا تھا کہ وہ بھرے میلے میں اپنے ’’بوائے فرینڈ‘‘ کے گلے میں بانہیں ڈال کر پھرتی تھیں، سیٹیاں بجاتی تھیں اور ڈانس کے دوران ہر سیکنڈ بعد

اپنے بوائے فرینڈ سے چمٹ جاتی تھیں۔ مجھے یورپ اور امریکہ کی نسبت پنجاب کے ان دیہات میں...... آزادیٔ نسواں (LIB WOMEN) کی تحریک زیادہ مضبوط محسوس ہوئی''۔

(۳) ''عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے کے باعث یہاں سالا ایک گھٹیا چیز اور بہنوئی ایک آسانی چیز سمجھی جاتی ہے تاہم ہر شخص جو یہاں بہنوئی کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے وہ بیشتر صورتوں میں کسی نہ کسی کا سالا بھی ہوتا ہے چنانچہ یہاں ہر شخص کی آدھی زندگی بطور بہنوئی اور آدھی زندگی بطور سالے کے گزرتی ہے''۔

(۴) ''اکثر قبروں پر مَیں نے مرحوم کے نام کے ساتھ ان کا عہدہ بھی درج پایا۔ یہ سب اہتمام دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے مرحوم فوت نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے صرف کوٹھی تبدیل کر لی ہے''۔

(۵) ''مَیں نے یہاں ایک آم دیکھا جس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ یہ لنگڑا آم ہے۔ مَیں نے تجربے کے طور پر اسے کھا کر دیکھا تو بے حد لذیذ پایا۔ مَیں نے سوچا ابھی یہ آم لنگڑا ہے اور یہ عالم ہے۔ اگر یہ لنگڑا نہ ہوتا تو خدا جانے کس قدر لذیذ ہوتا؟''

(۶) ''میرے دوست نے ایک مریل سے دنبے پر ہاتھ رکھا اور مالک سے پوچھا ''یہ سچ مچ کا دنبہ ہے یا اسے مار مار کر دنبہ بنایا ہے؟''

(۷) ''لاہور میں میری موجودگی کے دوران کئی مشہور شخصیتوں کا انتقال ہوا۔ مَیں نے اخباروں میں مختلف لوگوں کے بیان پڑھے جن میں ہر مرنے والے کے بارے میں کہا گیا تھا کہ مرحوم کے انتقال سے ایک خلا پیدا ہو گیا۔ دراصل یہ مشرقی لوگ الفاظ کے معاملے میں بہت فیاض واقع ہوئے ہیں ورنہ ان میں سے ایک آدھ مرحوم ضرور ایسا بھی ہو گا جس کی موت سے کوئی خلا پر ہو گیا ہو گا''۔

یہ سفرنامہ اصل میں ہمارے بہت سے سفرنامہ نگاروں کیلئے بھی طنز کا درجہ رکھتا

ہے، جو جغرافیے کی چند کتابیں پڑھ کے کسی ملک کی تہذیب و تمدن کے جملہ ذائقے اپنی زبان پر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ بدیسی ثقافت کا کوئی ایک پہلو دیکھ کے نہ صرف مجموعی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات تو ماہرانہ مشورے دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ حالانکہ ان کے یہ تجزیے اس طرح کی مضحکہ خیزی کے امین ہوتے ہیں، جو آپ کو اس مثال میں دکھائی دے گی:

''اپنے ملک سے روانہ ہوتے وقت میں نے اپنے ایک پاکستانی صنعت کار دوست کو اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ چنانچہ شام کو وہ مجھے ہوٹل سے اپنے بنگلے میں لے گیا جہاں اس نے میرے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ یہاں عورتیں، مردوں کے شانہ بشانہ مے نوشی میں مشغول تھیں اور اپنے دوستوں کے بازوؤں میں جھول رہی تھیں۔ میں بھی ان پر مسرت لمحات سے پوری طرح فیض یاب ہوا۔ یہ بیس کنال میں واقع بارہ بیڈروم کا بنگلہ تھا، جس میں میرا دوست اور اس کی خوبصورت بیوی رہتی تھی۔ یہاں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ پاکستان کی تہذیبی اور معاشی پسماندگی کے بارے میں ہمارے پریس کا تمام پراپیگنڈہ بے بنیاد ہے...... ایک لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس ''فرسٹ ہینڈ انفارمیشن'' ہو''۔

ہمارے منفرد مزاح نگار عطاء الحق قاسمی نے ایک مڈل کلاس گھرانے میں جنم لیا۔ ٹاٹ سکولوں سے لے کے پنجاب یونیورسٹی تک میں تعلیم حاصل کی۔ نوجوانی میں امریکہ کی سیاحت کا تجربہ ہوا۔ طویل عرصے تک تدریس کے شعبے سے منسلک رہے۔ اور بالآخر متعدد ملکوں کی سفارت سے فیض یاب ہوئے۔ ان تمام حالات میں سیاحت وصحافت سے بھی اٹوٹ یارانہ رہا۔ اس تمام نشیب و فراز کا دورانیہ نصف صدی پہ محیط ہے، جس میں انہوں نے دنیا بھر کی مختلف تہذیبوں، نیز وطنِ عزیز کے جملہ طبقات د

رسوم کا نہایت قریب اور کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور ان کے موازنے کے بعد پیدا ہونے والی دلچسپ صورت حال کو ایک مزے دار فینٹیسی کے روپ میں قارئینِ ادب کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

ہماری سوسائٹی کے جسم پہ گزشتہ کئی دہائیوں سے نمودار ہونے والے ناسوروں، جن میں معاشرتی منافقت، ذہنی مرعوبیت، اخلاقی گراوٹ، گھسے پٹے سماجی رویے بے جا نمود و نمائش، خلقِ خدا کی صحت سے کھیلنے والے قصاب مارکہ ڈاکٹر، تھانہ کلچر، لوڈ شیڈنگ، ادبی سرقہ بازی، شاطرانہ سیاسی صورت حال، کلاسیکی موسیقی، اجتماعی جہالت، شوقیہ قانون شکنی، ٹریفک کے آداب سے ناواقفیت، علاقائی و گروہی تعصبات، ناکارہ دفتری نظام، فلموں کا مصنوعی اور مبالغہ آمیز کلچر، اختیارات کا ناجائز استعمال، ظاہر بیں علما خوشامد اور چاپلوسی، کمزور عقائد، فضول رسوم میں سرگشتہ لوگ، حکمرانوں کی امریکہ اور فوج نوازی، زرد صحافت، قواعد و ضوابط سے بے نیازی، حلال و حرام کے خود ساختہ معیارات، نیکی بدی کے بندھے ٹکے تصورات، یونانی ادویات کے تیس مار خاں حکما اور حفظانِ صحت و ایمان ضابطوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی وغیرہ شامل ہیں، کو ایک ماہر سرجن کی آنکھ سے دیکھا ہے اور ان معاشرتی مریضوں پہ ناک منھ چڑھانے یا ان کے لیے کلوروفام اور چیر پھاڑ کی بجائے، نہایت محبت کے ساتھ مسکراہٹ تھراپی تجویز کی ہے...... میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ گہرے قومی دکھ اور بے مثال قہقہوں سے بیک وقت بھری پڑی ہے۔

اشفاق احمد ورک

۲۲ جون ۲۰۰۷ء